چنار کے پنجے

دیپک بُدکی

افسانوں کا مجموعہ

چنار کے پنجے

دیپک بُدکی

نام کتاب : چنار کے پنجے (افسانوں کا مجموعہ)

مصنف : دیپک بدکی

قیمت : -/۲۰۰ روپے

اشاعت : پہلا ایڈیشن (مجلد) ۲۰۰۵ء

دوسرا ایڈیشن (مجلد) ۲۰۱۳ء

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸، گلی وکیل، کوچہ پنڈت،

لال کنواں، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷

÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷

CHINAR KE PANJE: DEEPAK BUDKI

(Collection of Short Stories)

Price: Rs 200/-

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil,Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-110006

website;wwww.ephbooks.com:email;ephdelhi@yahoo.com

انتساب

گاندھی جی کے اصولوں پر چلنے والے
اپنے پھوپھا
آنجہانی شام لال صراف کے نام
جنھوں نے میرے وجود کو عنوان دے دیا

تحریر ظهری

اس مجموعے کے سبھی کردار ، مقامات اور واقعات فرضی ھیں۔
کسی شخص ، مقام یا واقعه سے کوئی مناسبت محض اتفاق هو
سکتا ھے جس کے لیے مصنف یا ناشر پر کوئی ذمّے داری عاید
نهیں هوگی۔

سپاس نامہ

میں ان مدیر حضرات کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میری پیہم حوصلہ افزائی کی اور میرے افسانوں کو اپنے گراں قدر رسالوں اور اخبارات میں وقتاً فوقتاً جگہ دی۔ جن رسالوں میں یہ افسانے چھپے ہیں ان کے نام یوں ہیں۔

اماں (کتاب نما دہلی جنوری ۲۰۰۰ء، جہات سرینگر جولائی تا ستمبر ۱۹۹۹ء)، مانگے کا اجالا (استعارہ دہلی جولائی تا دسمبر ۲۰۰۱ء، انشاء کولکتہ)، ایک نہتے مکان کا ریپ (روز نامہ ملاپ دہلی ۲۳ جولائی ۲۰۰۰ء، پرواز ادب پٹیالہ جنوری فروری ۲۰۰۰ء)، ٹک شاپ (سب رس حیدر آباد جنوری ۲۰۰۲ء، انشاء کولکتہ جنوری فروری ۲۰۰۰ء)، چنار کے پنجے (روز نامہ ملاپ دہلی ۷ جنوری ۲۰۰۱ء، انشاء مارچ اپریل ۲۰۰۱ء)، موچی پہلا (شاعر ممبئی، پرواز ادب پٹیالہ ستمبر اکتوبر ۲۰۰۳ء)، ورثے میں ملی سوغات (کتاب نما ستمبر ۲۰۰۱ء، انتساب شمارہ ۴۶، الانصار حیدر آباد، شیرازہ سرینگر)، مخبر (نیا ورق ممبئی، جدید فکر وفن، شاندار جنوری ۲۰۰۴ء، پروازِ لندن، ہندی ترجمہ کوشر سماچار اکتوبر ۲۰۰۵ء، انگریزی ترجمہ کشمیر سینٹی نیل جموں، شبجار آن لائن، تیلگو ترجمہ 'پوڑو' ۲۸ دسمبر ۲۰۱۰ء)، ویوگ (سب رس حیدر آباد اپریل ۲۰۰۲ء، شیرازہ سرینگر)، کُتا رو فادار کُتا (جدید فکر وفن اپریل تا جون ۲۰۰۱ء، خوشبو کا سفر حیدر آباد ۲۰۰۳ء)، فریب گفتار (انتساب سرونج)، سفید کراس (پروازِ ادب جنوری فروری ۲۰۰۲ء، جدید فکر وفن، روز نامہ اردو ٹائمز ۶ جون ۲۰۰۴ء)، آؤ کچھ اور لکھیں (انتساب سرونج مارچ ۱۹۹۹ء، احتساب سرینگر اکتوبر ۱۹۹۹ء، محفل صنم جنوری ۲۰۰۲ء)، پارٹی (خوشبو کا سفر حیدر آباد، امکان لکھنؤ)، احتجاج (کتاب نما دہلی، مژگاں کولکتہ)، وہ الھڑ لڑکی (شمس وقمر جولائی ستمبر ۲۰۰۰ء، محفل صنم مئی ۲۰۰۱ء)، ایک خط جو پوسٹ نہ ہو سکا (خوشبو کا سفر حیدر آباد جون ۲۰۰۱ء)،

سپنوں کا شہر(سینک سماچار ۲۷ مئی ۱۹۸۷ء، مژگاں کولکتہ جون ۲۰۰۱ء، تعمیر سرینگر)، آخری سبق (سبق اردو، صدائے اردو بھوپال)۔

'چنار کے پنجے' سے متعلق وارث علوی، قمر رئیس، سلطانہ مہر، دیپک کنول، رفیق شاہین، انور ظہیر انصاری، حسن ساہو، سیدہ نسرین نقاش اور سرون سنگھ وغیرہم کے تفصیلی تاثرات موصول ہوئے جبکہ انور سدید، سید ظفر ہاشمی، عطیہ سکندر علی اور مدیر 'بیسویں صدی' کے تبصرے بالترتیب تخلیق لاہور، گلبن لکھنؤ، چہارسو راولپنڈی اور بیسویں صدی دہلی میں شائع ہوئے۔ میں ان سبھی ادیبوں کا بے حد ممنون ہوں۔ علاوہ ازیں ان ادیبوں اور قارئین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اشاعت کے وقت الگ الگ افسانوں پر مختلف رسالوں میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ قارئین کی بے باک رائے قلمکار کے لیے مشعلِ راہ کا کام کرتی ہے۔

اس مجموعے کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کو منظر عام پر لانے کے لیے کئی لوگوں کا یوگدان رہا ہے جیسے ناشر، کمپیوٹر کمپوزر، پرنٹر اور پروف ریڈر۔ ان کے بغیر یہ مجموعہ آپ تک پہنچانا مشکل تھا۔ اس لیے ان سب کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض بنتا ہے۔

دیپک بدکی

☆☆☆☆☆

فہرست

☆☆☆☆☆

پیش لفظ۔ دوسرا ایڈیشن

'چنار کے پنجے' کا دوسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اردو سے محبت کرنے والوں اور اردو لائبریریوں کی کرم فرمائیوں کے سبب پہلا ایڈیشن چند ہی برسوں میں فروخت ہوا۔ مجموعے کے بارے میں قارئین کے تاثرات پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ میری کوششیں بارآور ہوئیں اور اکثر و بیشتر افسانوں کو پسند کیا گیا۔ اس سے بھی بڑھ کر خوشی تب ہوئی جب گوگل سرچ سے یہ معلوم ہوا کہ 'چنار کے پنجے' کے نسخے یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں دستیاب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن چھپوانے کا فیصلہ کر لیا۔

'چنار کے پنجے' میں شامل افسانے ہم عصر حالات کا آئینہ ہیں۔ ان افسانوں میں ایک جانب آپ کو سماجی حقیقت نگاری ملے گی اور دوسری جانب نفسیاتی و جنسیاتی الجھنوں کی گرہیں کھولنے کی کوشش۔ یہ سچ ہے کہ میں موپاساں، آئین رینڈ اور خلیل جبران سے کافی متاثر ہوا ہوں جبکہ اردو ادب میں پریم چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی میرے مطالعے کا مرکز رہے ہیں۔ پھر بھی ان سب میں سے منٹو میرے چہیتے افسانہ نگار ہیں۔ یہاں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا اسلوب میرا اپنا ہے۔ میں نے نہ تو کسی موضوع کو کبھی دہرایا ہے اور نہ ہی کسی افسانہ نگار کی تتبع کرنے کی کوشش کی ہے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ پہلے ایڈیشن کی طرح ہی اس ایڈیشن کی بھی خوب پذیرائی ہوگی۔ علاوہ ازیں قارئین کی گراں قدر آراء کا بھی انتظار رہے گا۔

دیپک بدکی

وسندھرا، غازی آباد (یو پی)

یکم نومبر ۲۰۱۳ء

☆☆☆☆☆

پیش لفظ۔ پہلا ایڈیشن

میرا پہلا افسانوی مجموعہ 'ادھورے چہرے' سن ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آیا۔ سال بھر میں پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا جس کی وجہ سے کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ حالانکہ بحیثیت افسانہ نگار مجھے ایسا کوئی مالی فائدہ نہ ہوا جس پر میں اتراتا تاہم یہی کیا کم ہے کہ قارئین نے میرے افسانے پڑھے ،سراہے اور اپنی رائے سے نوازا۔ علاوہ ازیں اردو کے بیشتر معتبر جرائد نے اس مجموعے پر ریویو شائع کیے۔ مجموعی طور پر میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ دل کا سودا گھاٹے کا سودا نہیں رہا۔

پانچ کروڑ اردو خواندہ آبادی میں پانچ سو کتابیں کھپ جانا صحرا میں ایک بوند کے جذب ہونے کے برابر ہے مگر اکثر و بیشتر ایسا بھی نہیں ہوتا۔ وجہ......؟ اردو قارئین کی بے رُخی، اردو ادیبوں کی بے مائیگی اور اردو ناشروں کی بے سامانی۔ رہا سہا کام اردو کے خود ساختہ محافظوں نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اپنی نقلی پہچان (Pseudo Identity) بنانے کے لیے انہوں نے مبالغہ آمیز خطابت (Rhetoric) سے کام لے کر پہلے تو ہندوؤں کو اردو سے الگ کرنے کی کوشش کی، پھر مسلمانوں کی نصف نسوانی آبادی پر غیر ضروری پابندیاں لگا کر انہیں ہم عصر تعلیم اور سائنٹفک لٹریچر سے محروم کر دیا اور اس کے بعد خود اردو نگار خانوں (اکادمیوں اور ترقی بیوروز) کے منتظم بن کر ان کو دیمک کی طرح چاٹ لیا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے آزادانہ ماحول میں پرورش پائی اور ان کے چنگل میں نہیں پھنسے، وہ بھی بدقسمتی سے انگریزی تعلیم اور بود و باش کی نذر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد ہم نہ تو پریم چند، بیدی یا منٹو پیدا کر سکے اور نہ ہی قرۃ العین، عصمت یا واجدہ۔

میرے ایک دوست ہندی کے لکچرر ہیں۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ 'ادھورے چہرے' کو ہندی میں چھپواؤں جسے کافی مالی فائدہ ہوگا۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کی اس تجویز سے پہلے ہی

میں نے ہندی کی گلیاں چھان ماری تھیں اور وہاں کی صورت حال اردو سے بھی بدتر اور غیر منفعت پائی تھی ۔ البتہ کرید نے کی غرض سے میں نے ان سے پوچھا۔

''پروفیسر صاحب، آپ کے گھر میں کتنے نیوز پیپر اور میگزین آتے ہیں؟''

''بس دو، ٹائمز آف انڈیا اور آوٹ لُک'' انہوں نے جواب دیا۔''

''کیوں ہندی کا میگزین نہیں منگواتے ؟'' میں نے پھر کریدا۔

''نہیں، فرصت کہاں ملتی ہے۔ کبھی کبھار شریمتی جی بک سیلر سے گرہ شوبھا یا سریتا اُٹھا کر لاتی ہیں اور وہ بھی جب ان کے خصوصی سلائی کڑھائی یا ویَنجن وشیشا نک چھپے ہوں۔ بس...!''

''کیوں آپ تو ہندی کے وِدھوان ہیں، آپ نہیں پڑھتے ہیں کیا؟''

''بھائی صاحب، مجھے تو اب ساہتیہ کے نام سے ہی نفرت ہو چکی ہے۔ ساہتیہ پڑھا پڑھا کر میں نے اپنی زندگی برباد کر دی۔ کسی ریونیو یا ایکسائز دفتر میں کلرکی کی ہوتی تو آج بیس پچیس لاکھ کی پراپرٹی کا مالک بن گیا ہوتا۔''

یہ ہے ہندی کا منظر نامہ۔ اردو کی تو خیر آپ کو خبر ہی ہے۔ اور یہ حال ہے اس ملک کا جس نے دنیا کو کالیداس، ٹیگور، غالب، پریم چند اور اقبال دیے، جہاں آج بھی کونارک، تاج محل، اور قطب مینار صدیوں کی تباہ کاریوں کے باوجود سینہ تان کر کھڑے ہیں اور جس کی ہواؤں میں آج بھی تان سین، میرا بائی، رحیم اور جائسی کی مدھر تانیں گونج رہی ہیں۔ تاہم آزادی سے پہلے علوم وفنون کی ایسی حالت نہیں تھی۔ خاص طور پر اردو زبان نے تو ملک میں تہلکہ مچایا تھا۔ ایک طرف انقلاب کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور دوسری طرف دہقان میدان عمل میں سینہ سپر تھا۔ ادھر جوشؔ اور ساحرؔ دلوں کو گرما رہے تھے، اُدھر میرا جی، اختر الایمان اور راشد اپنی ہی تلاش میں گم تھے۔ ایک سمت پریم چند، منٹو اور بیدی ہم عصر زندگی کی نقاب کشائی کر رہے تھے تو دوسری سمت عصمت اور قرۃ العین حیدر مردوں سے پنجہ لڑا رہی تھیں۔ آزادی کے بعد یہ ساری آوازیں آہستہ آہستہ ماند پڑ گئیں۔ ایک ایک

کر کے گُم ہوتی گئیں۔اردو زبان سیاست کاری کے ہتھے چڑھ گئی۔نہ ہندوستان کی رہی نہ پاکستان کی۔اب صورت حال یہ ہے کہ یہاں چند ایک مسلم گھرانوں کی لونڈی بن کر رہ گئی ہے اور وہاں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی داشتہ۔

افسوس کہ پانچ صدیوں کا گنگا جمنی ورثہ بوسیدہ لائبریریوں میں دھول کھاتا ہوا بے صدا ہو گیا۔ سوال یہ اُٹھتا ہے کہ آزادی کے بعد اردو کا یہ تنزل کیوں ہوا؟ اس کا جواب ہمیں اپنے باطن کو ٹٹول کر ڈھونڈنا ہوگا۔بقول آئن رینڈ (Ayn Rand)، اس ذہنی اور اخلاقی پستی کا خاتمہ کرنے کے لیے ہم ادیبوں، سائنسدانوں اور مفکروں کو اکٹھے مل بیٹھ کر کوئی نئی سبیل نکالنی ہوگی۔ہمیں کوئی 'جون گالٹ' (John Galt) پیدا کرنا ہوگا۔

میرے افسانوں کے بارے میں اکثر نقادوں کی رائے ہے کہ یہ میری زندگی کا درپن ہیں۔اس رائے سے میں اتفاق بھی کرتا ہوں اور انکار بھی۔اتفاق اس لیے کہ میری زندگی میں کوئی نہ کوئی حادثہ ایسا ضرور گزرا ہوگا جو تخلیقی تحریک کا سبب بن چکا ہوگا۔ایسے خیالات میرے ذہن میں برسوں الاؤ کی مانند سلگتے رہتے ہیں اور پھر کسی دن کہانی کا روپ دھارن کر کے صفحۂ قرطاس پر رونما ہو جاتے ہیں۔ انکار اس لیے کہ میں ان واقعات یا واردات کی فوٹو گرافی نہیں کرتا، یہ کہانیاں میرے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام تک چلتی رہتی ہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض سے واقف ہو جاتی ہیں اور تجربات کی آنچ میں پختہ ہو کر ہی سامنے آتی ہیں۔سر چشمۂ عمل سے تحریک پا کر میں کہانی کے اُتار چڑھاؤ، اس کے انجام کے ممکنات پر غور و خوض کرتا ہوں۔کئی امکانات سامنے آتے ہیں۔ان امکانات میں سے ایک کو چن لیتا ہوں جو میری نظر میں اس کہانی کے لیے فطری اور موزوں ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کہانیوں کے کردار بھی کسی نہ کسی موڑ پر مجھے مل چکے ہوتے ہیں مگر میں ان کی ہو بہو تصویر اتار کر یہاں چسپاں نہیں کرتا۔پیش کیے گئے کردار گوشت پوست کے چلتے پھرتے کرداروں سے مختلف ہیں۔وہ ان کے تخیلی اور تصوراتی روپ ہیں اور کچھ بھی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ میرے افسانے

جتنے حقیقت کے قریب دکھائی دیتے ہیں اتنے ہی اس سے دور بھی ہیں۔ ہاں میری یہ کوشش ضرور ہوتی ہے کہ پڑھتے وقت قاری کو کہانی پر سچائی کا گماں ہو۔ اسے یوں لگے کہ کہانی میں جو کچھ ہوا ہے یا ہو رہا ہے وہ ممکن ہے۔ ایسا اس کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ گھر میں ہو سکتا ہے، دفتر میں ہو سکتا ہے یا پھر سرِ بازار ہو سکتا ہے۔ اگر میں اس مقصد میں کامیاب ہوا ہوں تو اسے اپنی سعادت مندی سمجھ لوں گا۔

یہاں 'چنار کے پنجے' میں مشمول کہانیوں کے پسِ منظر پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ کہانیاں پچھلے دو تین سالوں میں لکھی گئی ہیں مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ واقعات بھی انہی دو تین سالوں پر محیط ہیں۔ چار کہانیوں نے ان دنوں جنم لیا جب میں کشمیر میں تعینات تھا۔ ۱۹۸۹ء میں دیکھتے ہی دیکھتے اس وادیٔ گلپوش کو دہشت گردی نے وادیٔ خموشاں بنا دیا۔ آزادی کے بعد چالیس سال جس شہر میں کہیں کوئی گولی کی آواز بھی سنائی نہیں دی، وہاں قتل و غارت روز کا معمول بن گیا۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ تین لاکھ سے زائد لوگ راتوں رات سینہ کوبی کرتے ہوئے ان دیکھے انجان بیابانوں میں پناہ لینے کے لیے بھاگ نکلے۔ ان کے بے بس مسلمان بھائی ان کو الوداع بھی نہ کہہ سکے۔ البتہ چند ایک نے حالات کا فائدہ اٹھا کر بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔ مگر ایسے درندوں کی تعداد کم تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہجرت کرنے والے لوگ اہل ہنود تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ آدمی ہجرتوں کا مارا ہے۔ وہ مصر سے نکالے گئے اہل یہود بھی ہو سکتے تھے، مکہ معظّمہ سے نکالے گئے اہل اسلام بھی ہو سکتے تھے یا پھر کربلا کے ریگ زاروں میں بھٹکتے آلِ رسول بھی ہو سکتے تھے۔ حق و باطل کی اس لڑائی میں ہمیشہ معصوم انسانوں کا ہی خون بہتا رہا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ آج کا انسان تہذیب یافتہ ہونے کے باوجود اپنی وحشیانہ جبلت پر قابو نہیں پا سکا ہے۔

چند سال پہلے مجھے اس سرزمینِ یاس کو پھر ایک بار دیکھنے کا موقعہ ملا۔ پژمردہ چہرے، سسکتی آہیں، اور اُکھڑی اُکھڑی سانسیں۔ بس یہی کچھ رہ گیا تھا اس وادی میں جہاں ایک زمانہ پہلے ہر لمحہ

جشن ریز، ہر کرن تنویر ریز اور ہر چہرہ تبسم ریز ہوا کرتا تھا۔ میں نے اپنے افسانے 'چنار کے پنجے' میں انہی تاثرات کو قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

کشمیر کے ماحول سے جڑی کئی اور کہانیاں بھی ہیں مگر ان کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ان دنوں کی یاد تازہ کرتی ہیں جن دنوں ہر طرف امن وامان تھا مثلاً 'ورثے میں ملی سوغات'، 'ویوگ'، اور 'آؤ کچھ اور لکھیں'۔ ان افسانوں کو لکھتے وقت جس ناسٹلجیائی کیفیت سے مجھے گزرنا پڑا وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

باقی ماندہ افسانے یا تو میری فوجی زندگی سے وابستہ ہیں یا پھر اس وقت سے جب میں دلّی اور چنڈی گڑھ میں نوکری کرتا تھا۔ آئے دن نئے تلخ وشیریں تجربات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ان افسانوں میں ہم عصر زندگی کی بے راہ روی، بے ضابطگیوں اور دلخراش تلخیوں کو درشانے کی کوشش کی گئی ہے۔

افسانے حاضر خدمت ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز وشرف۔ آپ کی گراں قدر رائے کا انتظار رہے گا۔

دیپک بُدکی

پاناجی، گوا

جنوری ۲۰۰۵ء

☆☆☆☆☆

امّاں

''آپ کا نام؟''

وہ سہمی ہوئی حیرت زدہ نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔اس کے منہ سے ایک بھی شبد نہیں نکلا۔ اس کے بدلے سوشل ویلفیئر آفیسر کنہیالال، جو میرے ہمراہ تھا، گویا ہوا۔

''سر، میں نے بہت کوشش کی مگر یہ لوگ کچھ بھی نہیں بولتے۔انہیں اس بات کا خدشہ ہے کہ آپ فیملی پلاننگ کے کارکن ہیں۔''

ایمرجنسی کے گھاؤ ابھی بھی ان کے دلوں میں تازہ تھے۔دو ہی سال پہلے کی تو بات تھی کہ ان کے گاؤں میں مرد وزن کو زبردستی پکڑ کر آپریشن کروایا گیا تھا۔ان میں سے کئی لوگ غیر شادی شدہ تھے اور کئی ایسے بھی تھے جو بڑھاپے کی وجہ سے اب بچے پیدا کرنے کے قابل بھی نہ تھے۔

''سر، اگر آپ نے غور کیا ہوگا، ہماری جیپ کو دیکھتے ہی سارا گاؤں سنسان ہو گیا۔سبھی لوگ مرد،عورتیں، بچے، بوڑھے بھاگ کر اپنے اپنے مکانوں میں چھپ گئے۔ان کا خوف ابھی تک نہیں جا سکا گو ایمرجنسی ختم ہوئے کئی مہینے ہو چکے ہیں۔'' کنہیالال نے وضاحت کی۔

''پر ہم تو فیملی پلاننگ کے لیے نہیں آئے ہیں۔''

''اب انہیں کون سمجھائے کہ ایمرجنسی تو کب کی ختم ہو چکی ہے۔سر، دراصل یہ قبیلے ہمیشہ پولیس کی لاٹھی کے سائے میں اپنی سانسیں گنتے رہتے ہیں۔عتابِ حکومت تو انہوں نے ورثے میں پایا ہے۔''

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اس بوڑھی عورت سے اجازت لی اور کشور شاہ کے ہمراہ مکھیا

کے گھر کی طرف چل پڑا۔ بڑھیا کی پر تجسس نگاہیں نیم واکواڑ کی اوٹ میں سے میرا تعاقب کر رہی تھیں۔

کشور اور میں دونوں انڈین سول سروسز کے پروبیشنر تھے۔ ہمارے چار اور ساتھی تھے جو ہماری طرح ہی ملحق گاؤں میں اعداد و شمار اکٹھا کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔ لال بہادر شاستری اکادمی آف ایڈمنسٹریشن کی طرف سے ہم سب پروبیشنروں کو گاؤں کے دورے پر اس لیے بھیجا گیا تھا تا کہ ہم دیہاتی زندگی سے بخوبی روشناس ہوں۔

یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں اُتر پردیش کے مظفر نگر کے اُون بلاک میں واقع ہیں۔ ان تینوں دیہاتوں میں، جہاں ہماری دونفری ٹیمیں بھیج دی گئی تھیں، باوڑی قبیلے کے لوگ رہتے ہیں۔ آزادی سے پہلے ان قبیلوں پر انگریزوں نے 'جرائم پیشہ قبیلے' کا لیبل چسپاں کر دیا تھا۔ گو ملک کو آزاد ہوئے تیس سال گزر چکے تھے مگر ان قبیلوں سے یہ لیبل اتارنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ کرتا بھی کون؟ اس میں نقصان اسی کا تھا۔ یہاں کے ہر فرد کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے۔ ہر شخص جو اپنے گاؤں کی لکشمن ریکھا پار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اس کو پولیس چوکی پر رپٹ لکھوانی پڑتی ہے۔ ابھی نوزائیدہ بچوں نے اپنی آنکھیں کھولی بھی نہیں ہوتی ہیں کہ ان پر جرائم پیشہ ہونے کا لیبل لگ جاتا ہے اور پھر انہیں اس کے سوا اور کوئی بھی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ جرم کو ہی اپنا پیشہ بنالیں۔ پولیس چاہے کوئی اور کام کرے یا نہ کرے مگر وہ کسی شخص کو یہ لکشمن ریکھا پھلانگنے نہیں دیتی۔ حکومت نے ایک سوشل ویلفیئر آفیسر کنہیا لال کو اس علاقے میں سماجی بہبود اور جن جاگرن کے کام پر تعینات کیا ہے۔ وہ نام ہی کا کنہیا نہیں ہے بلکہ اپنے کردار سے بھی کنہیا ہے۔ قبیلے کی دوشیزاؤں پر اس کی خاص نظر رہتی ہے۔

باوڑیوں کے جرائم کی کہانیاں سن کر ہم بھی خوفزدہ ہوئے۔ دن تو جیسے تیسے کٹ ہی جاتا لیکن رات بسر کرنے کے خیال سے ہی گھبرانے لگے۔ کشور اور میں دونوں ایک دوسرے کی جانب سوالیہ

نظروں سے دیکھتے رہے۔ اتنے میں سامنے ایک شوالہ دکھائی دیا جس کے صحن میں پیپل کے درخت کے نیچے ایک ملنگ سائیں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر زوردار قہقہہ لگایا۔ ہم نے قریب جا کر بڑے ہی ادب سے سر جھکا لیا اور اس کی بغل میں بیٹھ گئے۔ پھر اپنے دورے کا مدعا بیان کیا اور اس کی آشیرباد حاصل کی۔ چند ہی لمحوں میں وہ دنیا کی بے ثباتی اور ایشور کی حقیقت پر سنجیدگی سے لیکچر دینے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سارے لوگ نہ جانے کہاں سے کُگرمتوں کی طرح پھوٹ پڑے اور ہمارے اردگرد جمع ہو گئے۔ موقع کو غنیمت سمجھ کر میں نے سائیں سے درخواست کی۔

''سائیں، ہم چاہتے ہیں کہ آج رات مندر میں بھجن کیرتن ہو۔ سبھی گاؤں کے لوگ شرکت کریں۔ کتنا اچھا رہے گا۔''

میں نے اپنے دل میں چھپے خوف کو ظاہر ہونے نہیں دیا۔ میرے منہ سے ابھی یہ بات نکلی بھی نہ تھی کہ سائیں کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

''کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ تم لوگ تو سچے ایشور بھگت ہو۔ ہم نارائن کے پاٹھ اور بھجن کیرتن کا آیوجن کروائیں گے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگ اتنے بڑے ہیں پھر رات بھر کیسے جاگتے رہیں گے؟''

''سائیں۔ بھگوان سبھی کے لیے ایک سمان ہوتا ہے۔ اس کے سامنے نہ کوئی بڑا اور نہ ہی کوئی چھوٹا ہوتا ہے۔'' کشور شاہ نے جواب دیا۔

ہم نے کنہیالال کے ہاتھ میں دو سو روپے تھما کر پرساد کے لیے لڈو منگوائے۔ پاس ہی کھڑے لوگوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے دل کے خدشات اور وسوسے کافور ہو گئے۔ شاید انہیں اس بات کا اطمینان ہوا کہ ہم بھی انہی کی طرح گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان ہیں۔ سائیں نے تینوں گاؤں میں خبر بھجوا دی۔ سارے علاقے میں ایک نئی امید کی لہر دوڑ گئی۔ سبھی گھروں کے دروازے اب ہمارے استقبال کے لیے کھُل گئے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر ہم پھر اپنے کام میں جُٹ گئے اور دھیرے دھیرے ہم نے ہر ایک کنبے کے بارے میں معلومات اکٹھا کرلیں۔

کنبے میں کتنے افراد ہیں؟

کنبے کی کتنی آمدنی ہے؟

مردوں کا پیشہ....؟ عورتوں کا پیشہ...؟ کھیتی باڑی سے کتنی سالانہ آمدنی ہوتی ہے...؟ گاؤں میں کتنے ٹریکٹر استعمال ہوتے ہیں...؟ کتنی صنعتیں لگائی جاچکی ہیں...؟ بنکوں اور دیگر ذرائع سے کتنا قرضہ فراہم ہوچکا ہے...؟

گاؤں میں کتنے اسکول ہیں...؟ ان میں پرائمری اسکول کتنے ہیں اور سیکنڈری اسکول کتنے ہیں ..؟

گاؤں میں کوئی پرائمری ہیلتھ سینٹر یا ڈسپنسری ہے یا نہیں...؟ اگر ہے تو کیا وہاں پر معقول انتظامات ہیں یا نہیں...؟

ان سوالوں کے جوابات حاصل کرتے وقت کئی دلچسپ باتیں سامنے آگئیں جن میں سے چند ایک کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ کہ گاؤں میں صرف دو انڈسٹریز لگائی جاچکی تھیں۔ ایک آٹے اور مسالہ جات کی پسائی کے لیے اور دوسری سرسوں کا تیل نکالنے کے لیے۔ ان میں پہلی مکھیا کے بیٹے کے نام تھی اور دوسری اس کی بہو کے نام۔ اس طرح جتنے بھی قرضے تقسیم ہوئے تھے وہ سب مکھیا کے گھر ہی میں کھپ چکے تھے۔ دوسری بات یہ کہ عام طور پر لوگ گنے، گیہوں اور دالوں کی بوائی کرکے اپنی روزی روٹی کماتے لیکن پولیس کے کہنے کے مطابق اس کے باوجود قبیلے کے نوجوان چوری چکاری اور نقب زنی کے لیے دور دراز شہروں میں چوری چھپے چلے جاتے ہیں۔ پولیس کا کہنا تھا کہ نقب زنی میں ان لوگوں کو اتنی مہارت حاصل ہے کہ سیندھ لگاتے وقت کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط، ہم لوگ وثوق سے تصدیق نہیں کرپائے۔

اعداد و شمار جمع کرتے ہوئے کشور اور میں پھر اسی بڑھیا کی چوکھٹ پر کھڑے ہو گئے۔ وہ بھی ہمارے انتظار میں آنکھیں بچھائے کھڑی تھی۔

''آپ کا نام......؟ میں نے پھر سوال دہرایا۔

''ستیہ وتی۔'' وہ زیر لب مسکرانے لگی۔

''گاؤں کے لوگ اسے 'اماں' کے نام سے ہی پہچانتے ہیں۔ اس کا اصلی نام تو کوئی نہیں جانتا۔'' کنہیا لال نے مداخلت کی۔

''آپ کے گھر میں کتنے لوگ ہیں؟''

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ میرے سوال نے غیر ارادی طور پر اس کو ٹھیس پہنچائی۔ اس کا اکلوتا بیٹا برسوں پہلے پولیس کی حراست میں دم توڑ چکا تھا۔

''کوئی بھی نہیں، میں اکیلی ہوں۔'' وہ اپنے غم سے ابھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اکیلی......؟''

''ہاں، بالکل اکیلی۔''

''آپ اپنا گزارا کیسے کرتی ہیں؟''

''اب گزارا کرنے کی کیا بات ہے۔ یہ پاپی پیٹ تو کسی نہ کسی طرح پل ہی جاتا ہے۔ ایک اکیلی جان کے لیے کتنا درکار ہے۔''

''پھر بھی..... کچھ تو آمدنی ہوگی۔ ہوا پر تو نہیں جی سکتیں۔''

وہ مجھے ٹکر ٹکر دیکھنے لگی جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس کی باتوں سے مجھے ایسا لگا جیسے وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ کوئی بات اس کے ہونٹوں تک آتے آتے رُک جاتی تھی۔ میں نے کنہیا لال کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ مسکرایا اور اماں کی طرف داری کرنے لگا۔

''صاحب، اکیلی جان ہے بے چاری۔ پاس ہی کھیتوں سے لکڑیاں، بانس اور گھاس پھوس

جمع کر کے اسی پر گزارا کرتی ہے۔''

مجھے ان کی باتوں پر یقین نہ ہوتے ہوئے بھی یقین کرنا پڑا۔اس کی مفلسی پر مجھے ترس آیا۔'' کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں۔بنا آمدنی کے بیچاری کیسے گزر بسر کرتی ہوگی۔''

شام ہوتے ہی مندر کے احاطے میں ہلچل مچ گئی۔تینوں گاؤں کے لوگ شوالے کے سامنے جمع ہوگئے۔مرد، عورتیں، لڑکے، لڑکیاں، بچے اور بوڑھے۔یوں لگتا تھا جیسے کوئی کمبھ کا میلا ہو۔پھر مندر کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔رامائن کے پاٹھ سے سارا ماحول پاکیزہ ہوگیا اور اس کے بعد بھجن کیرتن سے ساری فضا گونج اٹھی۔کنہیا لال نے ہارمونیم، ڈھولک، چمٹا اور جھانجھ کا انتظام کروایا تھا۔بھجن گانے والا گاؤں میں پہلے ہی موجود تھا۔اس کے سریلے گیتوں میں طلسمی اثر تھا۔چار سو شادمانی کا ماحول چھا گیا۔سائیں بہت خوش نظر آرہا تھا۔اس نے بھی ایک سریلا بھجن گایا۔عورتوں کے ہجوم نے بھی گانے والوں کا ساتھ دیا۔عورتوں، خاص کر لڑکیوں، نے رنگ برنگی پوشاکوں سے سارے ماحول کو گلزار بنادیا۔کئی منچلی لڑکیاں ہماری نظریں اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے بار بار ہمارے سامنے سے ہمکتی ہوئی گزر جاتیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے رات کے بارہ بج گئے۔کنہیا لال نے سائیں سے اجازت لے کر پرساد کا تھال اٹھایا اور بھگوان کے سامنے رکھ دیا۔کسی نے دو ایک منتر پڑھ کر بھگوان کو بھوگ چڑھایا اور یکا یک ساری فضا 'اوم جے جگدیش ہرے' کی آرتی سے گونج اٹھی۔

مکھیا ہمارے پاس ہی بیٹھا رہا۔اس نے اطلاع دی کہ ہمارے رات کے رہنے کا انتظام اس کے گھر میں کیا جا چکا ہے۔صرف ایک بات کی پریشانی ہوسکتی ہے اور وہ ہے مچھروں کی ورنہ تو سب انتظام ہو چکا ہے۔بات بھی صحیح تھی۔مکھیا نے ہمارے آرام کے لیے معقول انتظام کروایا تھا۔کھاٹ پر لیٹتے ہی میرے سامنے وہ سب حسین چہرے گھومنے لگے جن کو میں مندر میں کچھ دیر پہلے دیکھ کر آیا تھا۔معصوم، بے لوث اور بے غرض چہرے۔

''یہ لوگ جرائم پیشہ ہو ہی نہیں سکتے۔ جو لوگ جرائم پیشہ ہوتے ہیں ان کا تو قیافہ ہی کچھ مختلف ہوتا ہے۔'' میرے دل نے احتجاج کیا۔ مجھے ان کے جرائم کے سارے قصے من گھڑت معلوم ہو رہے تھے۔ ''اتنے سیدھے سادھے، بھگوان سے ڈرنے والے لوگ جرائم پیشہ کیسے ہو سکتے ہیں؟''

ان لوگوں کے جرائم کی کہانیاں سن کر میں نے سوچا تھا کہ ہمیں صبح کا سورج دیکھنا بھی نصیب نہ ہوگا۔ کہاں تو میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے رات کیسے کٹے گی اور کہاں یہ صورت حال تھی کہ میں بے خوف وخطر ان چہروں کو اپنے ذہن میں بسا کر مچھروں کی بھنبھناہٹ سے بے خبر خراٹے لینے لگا۔

پو پھٹتے ہی مکھیا کا بیٹا ہمارے کمرے میں داخل ہوا اور معذرت کے ساتھ ہمیں دو لوٹے پکڑا کر کہنے لگا۔ ''صاحب، سامنے واٹر پمپ ہے۔ اس سے پانی نکال کر ہاتھ منہ دھو لیجیے۔ ہاں رفع حاجت کے لیے جنگل جانا پڑے گا۔''

''جنگل......؟'' میں نے حیرانگی سے اس کو دیکھا کیونکہ مجھے دور دور تک کہیں کوئی جنگل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''صاحب، یہ سامنے کھیت ہیں نا۔ کہیں بھی بیٹھ جایئے۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں نے لوٹا اٹھایا۔ پمپ سے پانی بھرا اور کھیتوں کی جانب چل پڑا مگر کہیں بھی بیٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ''آخر میری پرائیویسی کا کیا ہوگا؟ مجھے تو بند باتھ روم میں ٹٹی جانے اور غسل کرنے کی عادت ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔'' اس الجھن کو سلجھانا میرے لیے مشکل تھا۔ بہر حال جھینپتے ہوئے اور نظریں بچاتے ہوئے میں نے شکر کے پیڑوں کے بیچوں بیچ بیٹھ گیا۔ آس پاس کئی عورتیں اسی غرض سے لاتعلق سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے ان کے وجود کا پورا پورا احساس تھا۔ جوں توں کر کے میں جلدی سے فارغ ہو کر واپس چلا آیا اور پھر غسل وغیرہ کر کے تیار ہو گیا۔

ہم سب برآمدے میں بچھی ہوئی چٹائیوں پر ناشتے کے لیے بیٹھ گئے۔ مکھیا کی بے حد حسین بہو پراٹھے لا لا کر ہماری تھالیوں میں ڈالتی رہی۔ اس کی پائل کی جھنکار اور چوڑیوں کی کھنک اس کے

نازک خرام میں چار چاند لگا رہے تھے۔ مستعدی کے لیے اس نے اپنی ساڑی کا پلّو اپنی کمر سے لپیٹ کر اسی میں ٹھونس دیا تھا جس کی وجہ سے پاؤں اور ٹانگوں کا نچلا حصہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پراٹھے پروستے ہوئے اس کا گلنار چہرہ اور چمکیلی آنکھیں اس کے حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔ میرے دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ وہیں عمر بھر ڈیرہ جمالوں۔

ناشتہ کرتے ہوئے میں نے مکھیا سے پوچھا۔ ''مکھیا جی، میں نے سنا ہے کہ یہاں بہت سارے گھروں میں گنّے سے نچوڑی گئی راب سے شراب کشید کی جاتی ہے۔ ہم نے تو کہیں بھی نہیں دیکھی۔''

مکھیا نے قہقہہ لگایا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ''اس کے لیے کوئی لمبی چوڑی فیکٹری تھوڑے ہی لگانی پڑتی ہے جو آپ دیکھ لیتے۔ یہاں تو کئی گھروں میں دیسی شراب بنتی ہے مگر حکومت کے ڈر سے وہ یہ سامان چھپا کر رکھتے ہیں۔''

میں نے آبکاری کے منظر کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ دوسرے ساتھیوں نے میری خواہش کی تائید کی۔ مکھیا، سوشل ویلفیئر آفیسر اور گاؤں کے دیگر معزز لوگ ایک دوسرے کو استفہامیہ نظروں سے ٹٹولنے لگے۔ مکھیا نے لاچار ہو کر کنہیا لال کو اشارے سے اجازت دے دی۔

''چلیے میں آپ کو دکھا دوں گا۔'' کنہیا لال ہماری طرف رخ کر کے بولا۔ وہ ہمیں پھر اسی گھر کی طرف لے چلا جہاں ہم ایک روز پہلے دوبار جا چکے تھے۔ اس نے دروازے کی کنڈی کھڑکائی۔ دروازہ کھلا اور سامنے بوڑھی اماں کھڑی تھی۔

''اماں، یہ صاحب لوگ شراب کھینچنے کے عمل کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ بہت ہی اُتسک ہیں۔''

اماں ہڑبڑائی اور تعجب خیز نظروں سے کنہیا لال کو دیکھتی رہی۔

''ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ بڑے ہی سجّن پُرش ہیں۔ کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ تم دکھا دو۔''

اماں بے دلی سے ہمیں اندر لے گئی۔ وہاں پر عرق کھینچنے کے لیے بہت سارے پتیلے اور خالی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے قرینے سے ایک کے اوپر دوسرا اور پھر تیسرا پتیلا رکھ دیا۔ ایک پتیلے میں

اس نے راب ڈال دی۔ اور اس کے بعد آگ سلگا کر چولھا گرم کیا۔

بڑھیا مہارت اور ہنر مندی سے یہ سارے کام انجام دے رہی تھی۔ اب نہ تو کہیں گھبراہٹ کی بو باس تھی اور نہ ہی ماتھے پر خوف و ہراس کی شکنیں۔

دھیرے دھیرے بھاپ قطرہ قطرہ شراب بنتی رہی۔ میں شراب کھینچنے کے اس طریقۂ کار کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ جتنی دیر اماں یہ سب کارروائی کرتی رہی میں اس کے سراپا کو بغور جائزہ لیتا رہا۔ گو میرے سوال کا جواب اب مل چکا تھا پھر بھی ایک بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اس شراب کو اماں باہر بیچنے کے لیے کیسے بھیجتی ہے۔

''ان شراب کی بوتلوں کو شہر تک لے جانے کے لیے گاؤں کے معصوم بچوں کا استعمال ہوتا ہے۔'' کنہیا لال جیسے میرے من کے اندر اٹھے سوال کو تاڑ گیا۔

مظاہرہ ختم ہوتے ہی ہم نے اماں سے رخصت مانگی اور مکھیا کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔

ایک دو بار میں نے مڑ کر دیکھا۔ اماں وہیں نیم وا دروازے پر کھڑی احساس گناہ میں جکڑی مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اس نے اپنا بیٹا آج ہی کھو دیا ہو۔

☆☆☆☆☆

مانگے کا اُجالا

دوسرے بچّے کی آمد آمد تھی۔ میں اور میری بیوی بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے جو دن معین کیا تھا وہ کب کا گزر گیا۔ مگر زچگی کے آثار ابھی تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس دور افتادہ جگہ پر اپنا پرایا ایسا کوئی نہ تھا جس سے مشورہ لیتے۔

آخر کار مجھ سے رہا نہ گیا۔ دفتر میں اپنے افسر کرنل چڈّا سے صلاح لی۔ انہوں نے فوراً ملٹری اسپتال سے ملٹری ایمبولنس بلوائی اور شوبیتا کو تیج پور بیس اسپتال بھجوا دیا۔ دوسرے روز میں بھی تیج پور روانہ ہوا۔

''سر مبارک ہو، سورج سا بیٹا ہوا ہے۔'' میں ابھی آفسر فیملی وارڈ کے اندر جانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی ایک نرس نے مجھے یہ خوش خبری سنائی۔

''تھینک یو سسٹر، تھینک یو ویری مچ۔'' میں نے تعظیم و تکریم کے ساتھ اس وردی پوش نرس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے کاندھوں پر پیتل کے تین ستارے چمک رہے تھے اور بائیں چھاتی کے ابھار پر نام کی پٹّی سیفٹی پن سے بندھی ہوئی تھی۔

قریب جا کر میں نے نام پڑھنے کی کوشش کی۔ ''کیپٹن ٹینا گنگولی۔''

''دیٹ از رائٹ سر'' وہ مسکرا کر چل دی۔

مجھے اس بات کا تعجب ہوا کہ یہ سب اتنی جلدی کیسے ممکن ہوا۔ وہاں ٹینگا ویلی میں تو دردِ زہ بھی نہ اٹھا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ داخلہ لینے کے فوراً بعد ہی مریض کو گلوکوز چڑھایا گیا اور رات کو معمولی سا آپریشن کر کے بچہ برآمد کیا گیا۔

وارڈ کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے بچے کے ملائم گالوں کو پچکارا۔ وہ مہرِ تاباں کی طرح اپنی

تابندگی بکھیر رہا تھا۔ نظر بد سے بچانے کے لیے کسی نے اس کے ماتھے پر کاجل کا بڑا سا ٹیکہ لگا یا تھا۔
''یہ ٹیکہ کس نے لگایا؟''میں نے شویتا سے پوچھا۔
''سسٹر ٹینا نے ۔وہ کہتی تھی کہ ڈیلوِری کے وقت بچّے کو بدلنے کی کوشش کی گئی تھی مگر سسٹر نے ان کے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔''ڈری سہمی شویتا بچے کو بار بار چھو رہی تھی ۔
''کم آن ۔تم اور تمہارا شک.....وہم کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں۔''
''میں سچ کہہ رہی ہوں۔تمہیں وشواس نہیں آتا، نہ آئے ۔میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جو لوگ اس کو بدلنا چاہتے تھے ان کے ہاں چوتھی بار لڑکی پیدا ہوئی ہے۔انہوں نے حتی الامکان کوشش کی تھی مگر سسٹر ٹینا چوکس رہی۔''
''کیسی باتوں پر تم وشواس کرتی ہو۔یہ کوئی بچوں کا کھیل ہے جو جی میں آیا کر لیا۔اس سسٹر نے دیکھ لیا ہوگا کہ تم ضعیف الاعتقاد ہو، اس لیے شگوفہ چھوڑ دیا ہوگا۔''
''آپ کو ہر بات شگوفہ لگتی ہے۔فرض کر لو وہ لوگ بچہ بدلنے میں کامیاب ہو جاتے تو جانتے ہو کیا ہوتا۔ہم دونوں عمر بھر یہی مان کر چلتے کہ میری کوکھ سے لڑکی پیدا ہوئی تھی اور وہی ہماری اصلی اولاد ہے۔یہی جھوٹا سچ ہم عمر بھر اپنے سینے سے لگائے رہتے ۔
شویتا کی باتوں میں کافی وزن تھا۔اس کی دلیل سے میرے دل میں شبہات کے دھند لکے چھانے لگے تاہم میں نے شویتا کی ڈھارس بندھائی۔
''ایسی کونسی ماں ہوگی جو اپنے لختِ جگر کو الگ کرنے پر راضی ہوگی؟''میں نے سوال کیا۔
''بے چاری مجبور تھی۔سسرال والوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس بار بھی بیٹی جنی تو گھر واپس نہ آنا۔اپنے میکے میں اپنا بندوبست کر لینا۔''
''تم نے سنا اور یقین کر بیٹھیں ۔ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔''
''کیوں نہیں ہوسکتا۔آئے دن اخباروں میں خبریں چھپتی ہیں کہ اب مائیں رحم ہی میں بچے کے

جنس کا پتہ لگواتی ہیں اور اگر لڑکی ہوئی تو اسقاط کرواتی ہیں۔"

میں نے اس بحث کو آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ سال بھر میں میرا تبادلہ اروناچل پردیش سے شیلانگ ہوگیا جہاں ایک روز اچانک میرے پیٹ میں زور کا درد اٹھا۔ میں نے جیپ منگوائی اور فوراً ملٹری اسپتال پہنچ گیا۔

"آپ یہاں لیٹ جایئے۔" میجر مدھوک نے معائنہ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اپنی قمیض اور پتلون ڈھیلی کرکے میں ٹیبل پر دراز ہوگیا۔ میجر مدھوک نے اپنی انگشت شہادت سے میرے پیٹ کے نچلے حصے کو دبا دیا۔

"اوہ گاڈ" میں مینڈک کی طرح اچھل پڑا جیسے کسی برقی رو نے مجھے چھولیا ہو۔

میجر مدھوک نے وقت ضائع کیے بغیر مجھے فوراً اسپتال میں بھرتی ہونے کی ہدایت کی۔ میں نے ٹیلیفون پر گھر میں اطلاع دی اور خود براہ راست سرجن اسپیشلسٹ کے سامنے پیش ہوا۔

"سسٹر، ان کو جلدی آپریشن تھیٹر میں لے چلو۔ التہاب زائدہ کا کیس ہے۔ فوراً آپریشن کرنا پڑے گا۔" کرنل بدھوار نے میرا معائنہ کرکے اپنا اسٹیتھسکوپ کانوں سے اتارا اور پاس ہی کھڑی نرس کو حکم دیا۔

سسٹر نے میرے ہاتھ میں نیلا اور سفید دھاری دار پاجامہ تھما دیا اور ہدایت دی کہ سارے کپڑے اُتار کر صرف اس پائجامے میں آپریشن ٹیبل پر لیٹ جاؤں۔

"سسٹر، مریض کو جلدی تیار کرلو۔ کوئیک۔" باہر سے دوبارہ کرنل کی آواز آئی۔

"یس سر..."

سسٹر نے بڑے ہی تدبر سے میرا پائجامہ ڈھیلا کردیا اور دھیرے دھیرے اس کو نیچے کی طرف سرکالیا۔ پھر وہ بلیڈ سے میرے موئے زِہار صاف کرنے لگی تاکہ آپریشن کرتے وقت کوئی دقت پیش نہ آئے۔ میں یہ ساری کارروائی کسی مزاحمت کے بغیر دیکھتا رہا۔ نرس کے چہرے پر متانت صاف

جھلک رہی تھی۔

میری خوفزدہ آنکھیں آپریشن ٹیبل کے اوپر لٹکتے ہوئے جھاڑ کی روشنیوں میں زندگی تلاش رہی تھیں۔ بے ہوشی کی دوا سونگھنے کے بعد مجھے آگے کا حال معلوم نہیں البتہ جب ہوش آیا تو میں تھیئٹر کے بدلے افسر وارڈ کے ایک بستر پر کراہ رہا تھا۔ درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں گو ابھی بھی غنودگی چھائی ہوئی تھی۔

''پانی.... پانی....'' میں نے نرس کو آواز دی۔

ایک نرس میرے بیڈ کے قریب آ کر مجھے دلاسہ دینے لگی۔ یہ وہ نرس نہیں تھی جو آپریشن تھیئٹر میں ملی تھی۔ ''سر آپ پانی بالکل نہیں پی سکتے۔ آج دن بھر آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ آپ اپنے لعاب سے اپنے منہ اور ہونٹوں کو تر کرتے رہیے۔'' وہ ہمدردی اور شفقت کی مورت بن گئی۔ پھر اس نے اپنی نرم و گداز بانہوں میں میرا سر اٹھ کر تکیے کا غلاف بدل ڈالا۔ میں کنکھیوں سے اس کے گدرائے ہوئے بدن کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ میری اس حرکت کو شاید تاڑ گئی مگر میرا دل رکھنے کے لیے اس نے خفیف سی مسکراہٹ اپنے گلابی چہرے پر بکھیر دی اور گڈ نائٹ کہہ کر چلی گئی۔

دوسرے روز علی الصباح کپتان میناکشی ائینگر جو مجھے آپریشن تھیئٹر میں ملی تھی میری عیادت کے لیے وارڈ میں وارد ہوئی۔ ''سر آپ کیسے ہیں؟''

''پہلے سے بہتر ہوں۔'' میں نے اپنے چہرے پر مسکان اوڑھتے ہوئے اس کا سواگت کیا۔

شگفتہ دل، تبسم ریز میناکشی میرے قریب آئی۔ میرے ماتھے کو سہلایا۔ پھر میرے منہ میں تھرمامیٹر ڈال کر نبض ٹٹولنے لگی۔ آخر میں پاس رکھے ہوئے کاغذوں کی جانچ پڑتال کر کے ہوا میں سنبل کی خوشبوئیں گھول کر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ کئی بار آئی یا یوں سمجھیے کہ بار بار آئی۔

میری نوکری پیشہ بیوی بھی مزاج پرسی کے لیے روزانہ آجاتی مگر ہر بار میرے اردگرد دو تین نرسوں کو دیکھ کر حسد سے جل کر کباب ہو جاتی۔ بڑی حاسد قسم کی عورت ہے۔ اس کا بس چلتا تو وہ

اسپتال کی سفید چادر ہی میں مجھے گٹھڑی بنا کر لے اڑتی۔

ادھر بھگوان کی مرضی کچھ اور ہی تھی۔ٹانکوں میں پیپ بھر گئی۔میرا ڈسچارج مزید پندرہ روز کے لیے ملتوی ہو گیا۔وہ ڈاکٹر کو کوستی رہی اور میں دعائیں دیتا رہا۔اس دوران میں میناکشی کے ساتھ میرے مراسم کافی حد تک بڑھ گئے۔وہ رات دیر تک میرے پاس بیٹھ کر خوش گپیاں کرتی۔

اسپتال سے ڈسچارج کے بعد بھی میناکشی کے ساتھ میرا رابطہ بدستور قائم رہا۔کبھی ٹیلیفون پر بات ہو جاتی اور کبھی میں ہی اس کے میس میں جا کر اس سے ملاقات کر آتا۔پھر ایک روز میناکشی نے بتایا کہ وہ شادی کرنے جا رہی ہے۔لڑکا کیرلا کا برہمن ہے۔گلف میں نوکری کرتا ہے۔اس نے جیب سے اپنے منگیتر کی تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔دو ہفتے کے بعد اس نے طے شدہ پلان کے مطابق سنڈیکیٹ بنک میں ہم دونوں کی ملاقات بھی کروالی۔دیکھنے میں اوسط قد کا سیاہ فام متین لڑکا لگ رہا تھا۔

''ہیلو سر، آپ یہاں....؟'' میناکشی نے انجان بن کر مجھ سے پوچھا۔

''بس یونہی۔کچھ روپے نکالنے ہیں۔'' میں نے اس کے منگیتر کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''سر میٹ مائی ؤڈبی۔گوپی ناتھ۔'' اس کی طرف رخ کر کے وہ پھر بولی۔'' آپ ہیں، میجر اشوک رینا۔''

میں نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔''ہیلو ہَو آر یو؟ کب شادی ہو رہی ہے آپ دونوں کی؟'' میرا ردِ عمل عام دستور کے مطابق تھا۔

''بس اگلے مہینے۔''

''دیٹ اِز گریٹ۔شادی پر ہمیں بھولیے گا نہیں۔''

''نو سر، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔'' میناکشی نے اپنے منگیتر کے بدلے جواب دیا اور پھر اس کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر بنک سے باہر چلی گئی۔

میناکشی کی شادی اس کے آبائی گاؤں میں ہوئی۔ وہ مجھے دعوت نامہ بھیجنا بھول گئی یا شاید دیدہ و دانستہ نہ بھیجا ہو۔ گوپی ناتھ دس روز میں ہی گلف چلا گیا اور میناکشی شتابی واپس شیلانگ پہنچ گئی۔ پہنچتے ہی اس نے مجھے ٹیلیفون پر اطلاع دی۔ ''ہیلو سر، آپ کیسے ہیں؟''

''اچھا ہوں۔ تم آ گئیں.....؟ اتنی جلدی.....!'' میری آواز میں تحیّر اور تجسس کی ملی جلی کیفیت تھی۔

''ابھی ابھی پہنچی ہوں۔ ابھی تو سامان بھی نہیں کھولا ہے۔''

''شادی کیسی رہی؟ شادی مبارک ہو۔''

''بس سوسو.....!'' اس کے لہجے سے اکتاہٹ اور تھکاوٹ ٹپک رہی تھی۔

''گوپی ناتھ کیسے ہیں؟''

''وہ واپس گلف چلے گئے۔ بس دس دن کی چھٹی ملی تھی انہیں۔''

''سر آپ سنائیے، شویتا کیسی ہیں؟''

''وہ آج کل میکے میں ہے۔''

''اور بچے......؟''

''وہ بھی اسی کے ساتھ ہیں۔''

''مطلب یہ کہ آپ آج کل اکیلے ہیں۔ بور تو نہیں ہوتے؟''

''یونہی سمجھو۔ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔''

''میں شام کو گھر پر ملنے آؤں گی۔ کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''یو آر ویلکم۔ اس میں اعتراض والی کونسی بات ہے۔ ہاں میرا بیٹ مین ساڑھے پانچ بجے چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد چلی آنا۔''

''ٹھیک ہے۔''

شام ٹھیک چھ بجے میرے دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے ناریل کی خوشبوؤں میں ملفوف میناکشی کھڑی تھی۔ اندر آتے ہی وہ میرے ساتھ اتنے زور سے لپٹ گئی مانو برسوں کی جدائی کے بعد ملی ہو۔ وہ سیدھے بیڈروم میں گھُس کر میرے بیڈ پر دوزانو بیٹھ گئی۔

''کیئر فار اے ڈرنک؟'' میں نے رسمی طور پر پوچھا۔

''جن ہے تو پی لوں گی۔''

میں نے لیمن سوڈا ڈال کر اس کے لیے جن کا ایک گلاس بنایا اور خود اپنے لیے وہسکی کا جام بھر دیا۔

پھر ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ وہ بے تکلف ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ بستر پر دراز ہوگئی۔ اس کی مخمور آنکھیں دعوت دے رہی تھیں۔

''سر، آپ نے مجھے شادی پر کوئی تحفہ نہیں دیا۔'' وہ بولی۔

''مجھے کیا معلوم تمہاری شادی کب اور کہاں ہوئی۔''

''میں نے تو کارڈ بھیج دیا تھا۔ کیا آپ کو نہیں ملا؟''

''نہیں''

''آجکل ڈاک کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔ میں نے تو خود ہی پوسٹ کیا تھا۔''

''خیر چھوڑ دو ان باتوں کو۔ ہاں تم کچھ گفٹ کے بارے میں کہہ رہی تھی۔''

''سر، تحفہ تو آپ کو دینا ہی پڑے گا۔ ابھی کونسی دیر ہوگئی۔'' وہ لجاتے شرماتے کہنے لگی۔ مجھے ایسا لگا کہ ہزار دو ہزار کی چپت لگنے والی ہے۔

''تمہارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ تحفہ کیا چیز ہے۔''

''مجھے آپ کی نشانی چاہیے۔'' اس کا چہرہ تمتماہٹ سے انگارہ ہوگیا۔

''میں سمجھا نہیں.......!''

’’مجھے آپ کا بچہ چاہیے۔‘‘

اس کی بات سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں ذہنی طور پر اس مانگ کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ حیرت سے میں اس کے چہرے کو گھورنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی تراوٹ اور چمک تھی جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ اس کے اعضاء میں عجیب سی کشش، تناؤ اور تشنج پیدا ہو چکا تھا۔ وہ خود سپردگی کے عالم میں مچھلی کی مانند تڑپ رہی تھی۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر غنودگی کے سبب الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔ بلا ارادہ میرے بازو پھیلتے چلے گئے اور وہ ایسے کھنچی چلی آئی جیسے تنکا کہربا کی جانب۔ اس کے لبوں کا شہد اور بغلوں کی بو مجھے دیوانہ بنانے کے لیے کافی تھیں۔ جی میں آیا کہ لقمہ بنا کر یکمشت نگل ڈالوں۔ اسی طوفان میں ہم ایک دوسرے میں اپنا وجود کھو بیٹھے۔ طوفان تھم جانے کے بعد بھی میں اس کی حرارت سے لبریز چھاتیوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ میرا تجسس ابھی برقرار تھا۔ میں نے میناکشی سے سوال کیا۔ ’’گوپی ناتھ کے ساتھ ہنی مون نہیں منایا کیا؟‘‘

’’ہاں منایا۔ پورے ہفتے اکٹھے رہے مگر وہ تو چغد ہے۔ اس کو اس بارے میں کوئی علم نہیں۔ ان دنوں میرا سیف پیریئڈ چل رہا تھا۔ کوئی امکان نہیں.....!‘‘

’’اور اب....؟‘‘ میں نے استفسار کیا۔

’’آگے پندرہ روز بڑے نازک ہیں۔ میری تمنا ہے کہ ان دنوں ہم روزانہ ملتے رہیں۔ میں یہ چانس مس نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے آپ کا تخم چاہیے۔‘‘

’’مجھے لگتا ہے تم باؤلی ہو گئی ہو۔‘‘

’’نہیں سر یہ میری آرزو ہے۔ میں عمر بھر آپ کی نشانی کو گلے سے لگانا چاہتی ہوں۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔‘‘

میں نے سنا تھا کہ جنوبی ہند کی دوشیزائیں شہوت پرست ہوتی ہیں۔ گوری چمڑی والوں پر مرتی

ہیں   مگران کے ہیجان کا یہ حال ہوگا مجھے معلوم نہ تھا۔

''میناکشی۔میرے آپریشن کا وہ منظر یاد ہے؟''

''کونسا.....؟ کیا ہوا تھا اس دن.....؟''اس نے بے پروائی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

''یاد کرو۔آپریشن سے پہلے تم نے کیسے مجھے تیار کیا تھا۔میرا پائجامہ ڈھیلا کر کے نیچے کھسکا لیا تھا۔بلیڈ سے میرے پیڑو کی صفائی کی تھی۔میرے ننگ دھڑنگ جسم کو دیکھا تھا، چھوا تھا۔''

''ہاں،تو پھر کیا ہوا۔یہ تو ہمارا پیشہ ہے۔''

''کیا تمہیں اس وقت کچھ بھی محسوس نہ ہوا؟''

''سر،ڈونٹ بی سلّی۔اس وقت تو میں اپنی ڈیوٹی کر رہی تھی۔ایسا ہونے لگے تو ہم سبھی مریضوں کو چاٹتے پھریں گے۔مجھے تو اب یہ بھی یاد نہیں کہ اس دن میں نے کیا کچھ کیا تھا۔''وہ میری عریاں ران کو سہلاتے ہوئے بولی۔

''اوہ آئی سی.....''

اس نے پھر ایک بار اپنے گرم ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیے اور اپنے ملائم ہاتھوں سے میرے بدن کی آہستہ آہستہ دست مالی کرنے لگی۔پھر وہ اپنی تر زبان سے میرے بدن کے مختلف اعضاء کو چاٹنے لگی جیسے سارے بدن کا ذائقہ اپنے منہ میں ہمیشہ کے لیے سمیٹ کر لے جانا چاہتی ہو۔اس اشتہا انگیز کارروائی نے میرے بدن کا شعلہ پھر بھڑکا دیا اور میں نے اس آگ کو بجھانے کی خاطر دوبارہ اس کے جسم میں پناہ لی۔میناکشی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے برسوں کی سوکھی زمین پر ساون کی پھوار پڑی ہو۔

مہینہ بھر معاملہ یوں ہی چلتا رہا جب تک اس کے ڈسچارج پیپر تیار ہو گئے۔اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔آرڈر ملتے ہی وہ اپنے شوہر کو خوشخبری دینے کے لیے گلف چلی گئی۔

میناکشی کے ساتھ میرا رابطہ اسی دن ٹوٹ گیا جب اس نے شیلانگ کو خیر باد کہا۔البتہ اس کی

سہیلیوں سے کچھ اڑتی اڑتی خبریں سننے کو ملتیں۔ پہلی یہ کہ اس نے خوبصورت بیٹے کو جنم دیا ہے اور دوسری یہ کہ اس نے کسی اسپتال میں نرس کا کام سنبھالا ہے۔ ان خبروں کی تصدیق کے لیے میں نرسنگ آفیسرس میس میں اس کی کلوز فرینڈ سے ملا۔ ''بینا کشی کی کوئی خبر....؟'' میں نے پوچھا۔

''شی از فائین.... کل ہی اس کی چٹھی آئی تھی۔ بڑے مزے میں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''سنا ہے کہ نوکری کر رہی ہے؟'' میں نے کریدا۔

''ہاں سر، وہیں ایک اسپتال میں نرس کا جاب ملا ہے۔''

''میں نے تو سنا تھا کہ اس کا بچہ پیدا ہوا ہے۔ پھر وہ نوکری کیسے کر پا رہی ہے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''یس سر، لڑکا تو پیدا ہوا تھا مگر اس کو کیرلا میں اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر واپس چلی گئی۔'' وہ میری آنکھوں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی رہی۔

کچھ دیر بعد میں نے اس سے رخصت لی اور بجھا بجھا اداس سا اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ باہر تاریکی کا عالم تھا۔ گیلی سڑک کے دونوں کناروں پر گھنے درختوں کے مہیب سائے ڈراونے لگ رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم کا کوئی حصہ ٹوٹ کر کہیں دور صحرا میں کراہ رہا ہو۔ میں اپنے بکھرے ہوئے وجود پر فکرمند تھا۔ میرے کانوں میں کسی معصوم بچے کی کلکاریوں کی آوازیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

سارے ماحول میں طلسمی سنسناہٹ سی چھائی ہوئی تھی۔ دور کہیں دور کوئی کویل اپنی درد بھری آواز میں کوک رہی تھی۔ کچھ دن پہلے اس نے اپنے انڈے کسی کوّی کی تحویل میں رکھ چھوڑے تھے۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی مگر آج پتہ نہیں کیوں وہ دن بھر اس گھونسلے کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ناکام رہی۔ مایوس ہو کر وہ اپنے خالی گھونسلے میں لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆☆☆

ایک نہتے مکان کا ریپ

ایک ٹرنک، ایک اٹیچی اور ایک بستر۔ بس یہی مال ومتاع سمیٹ کر وہ اندھیری رات میں گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ چھ روحیں....! وہ، اس کی بیوی، دو کمسن بچے اور دو ناتواں بوڑھے جن کا بوجھ اسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہو رہا تھا۔

''امّی ہم اس اندھیلے میں کہاں جا رہے ہیں؟'' سات سالہ بچی ماں سے استفسار کرنے لگی۔

''جہنم میں.... تم چپ کر کے نہیں بیٹھ سکتی۔'' ماں خفا ہوگئی۔

بچی کا منہ بند کرنے کے لیے یہ فقرہ کافی تھا مگر وہ کہاں جا رہے تھے انہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی بیوی نے صدر دروازے پر سانکل چڑھا دی اور پھر کنڈی میں تالا لگا کر اس کو دو تین بار زور سے اپنی طرف کھینچا۔ جب تالا کھلا ہی نہیں تو اسے اطمینان ہوا کہ اب مکان محفوظ ہے۔

دھیرے دھیرے سارا کنبہ نہ جانے اندھیرے میں کہاں کھو گیا۔ تالا کوئی بھی توڑ سکتا تھا۔ اب وہاں کون کس کو روکنے والا تھا۔ تالا بذات خود محافظ نہیں ہوتا۔ محافظ ہوتے ہیں آس پاس کے لوگ جو لاشعوری طور پر پڑوسیوں کی جان و مال کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن یہاں پر حالات نے ایسی کروٹ بدلی تھی کہ پڑوسیوں پر اعتبار کرنا محال تھا۔ انھیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، دوسروں کی رکھوالی کیا کرتے۔ اگر وہ کسی کو تالا توڑتے دیکھ بھی لیتے تاہم ان کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ اپنی کھڑکیاں بند کر کے چپ چاپ اندر بیٹھے رہیں جیسے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔ اور پھر ایسا جوکھم اٹھانے سے فائدہ بھی کیا تھا۔ تالاب میں رہ کر مگر مچھ سے بیر۔

کئی دن اور کئی مہینے تالا اپنی جگہ پر لٹکتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اصلی مکینوں کے لوٹنے کی امیدیں بجھتی گئیں۔ مکان کے پاس سے گزرنے والا ہر شخص حسرت بھری نگاہوں سے تالے کو دیکھتا رہتا اور پھر اپنے من میں سوچتا ''کاش یہ تالا خود بخود ٹوٹ کر گر جاتا اور یہ دروازہ اپنے آپ ہی کھل جاتا۔''

جب کسی نامعلوم شخص نے اماوس کے اندھیرے کی آڑ لے کر آخر کار تالا توڑ دیا تو سبھی نے راحت کی سانس لی۔ وہ اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھنے لگے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی شخص اس گناہ میں ملوث نہ تھا۔

کسی معصوم دوشیزہ کو جُل دے کر بازارِ حسن میں بٹھانا گناہ ہوتا ہے مگر اس کے بدن سے حظ اٹھانا کوئی گناہ نہیں سمجھا جاتا کیونکہ اس کے لیے قیمت چکائی جاتی ہے۔

اس واقعہ کے بعد مکان کا صدر دروازہ کھلے کا کھلا رہ گیا مانو کسی طوائف کا کوٹھا ہو۔ کنڈے میں لٹکتے ہوئے تالے سے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ہڑبڑاہٹ میں پوری طرح سے نتھ اتارنا بھول گیا ہو اور وہ نتھ ناک ہی میں لٹکتی رہ گئی ہو۔

تالا جس شخص نے توڑا تھا وہ ایک خونخوار دہشت گرد تھا جو سیکورٹی فورسز سے چھپتا چھپاتا، دوڑتا بھاگتا اس گھر میں گھس گیا تھا۔ مکان نے رات بھر اس کو اپنی آغوش میں سہارا دیا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی اپنے کندھے سے اے کے فورٹی سیون رائفل اتار کر کرسی پر ایسے پھینک دی تھی گویا برسوں کی آزردہ زندگی کا بوجھ ہلکا کر رہا ہو۔ پھر اپنے بھاری بھرکم جسم کو بھی اسی تحقیر سے گداز بستر پر گرا دیا تھا اور چند ہی لمحوں میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا۔

آدھی رات کو وہ بھوک اور پیاس کی تاب نہ لا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے کرسی پر رکھی ہوئی اے کے فورٹی سیون اس کی بھوک مٹا سکتی تھی نہ پیاس۔ ہمت کر کے اس نے سگریٹ سلگایا اور اسی دھیمی روشنی کے سہارے کچن میں پانی ڈھونڈنے لگا۔ بجلی جلانا تو خطرے سے خالی نہ تھا۔ جوں توں کر کے اس

نے مٹکے سے پانی نکال کر غٹ غٹ پی لیا۔ پھر ایک کے بعد ایک کئی دیا سلائیاں جلا کر کھانے پینے کا سامان ڈھونڈنے لگا۔ کچن صفاچٹ تھا۔ کہیں پر کچھ بھی نہ تھا۔ ''سالا، کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے گھر میں۔ سب لے کر بھاگ گئے ہیں۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ ابل پڑا۔

پھر سامنے ایک چھوٹی سی الماری پر نظر پڑی۔ وہاں دیوی دیوتاؤں کے بہت سارے فوٹو سجے ہوئے تھے۔ سامنے دھوپ دان میں جلی ہوئی دھوپ کی ٹھنڈی راکھ تھی۔ بغل میں ایک تھال تھا جس میں مقامی تہوار 'پَن' کے دن دیوی کو بھینٹ چڑھائے گئے پانچ موٹے اور میٹھے روٹ تھے۔ ان میٹھے روٹوں کی جب پوجا ہو رہی تھی تو پنڈت جی نے ایک دلچسپ کہانی سنائی تھی جس سے کنبے کے سبھی افراد دیوی ماں کے قائل ہو چکے تھے۔

''یہ تہوار ہزاروں سال سے منایا جاتا ہے۔ اس موقعے پر ہر گھر میں روٹ بنائے جاتے ہیں جن کو دیوی ماں کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ بہت عرصہ پہلے ایک راجہ ہوا کرتا تھا جس کی بیوی نہایت نیک اور دھارمک استری تھی۔ بہت ہی خوشحال کنبہ تھا ان کا۔ مگر خود راجہ بڑا ہی گھمنڈی اور ناستک تھا۔ ہر سال رانی حسب معمول 'پَن' کے تہوار پر شردھا اور نشٹھا سے گندم پسوا کر اپنے ہاتھوں سے رات بھر میٹھے میٹھے روٹ بیلتی اور پھر انہیں دیسی گھی میں تل کر دیوی ماں کے چرنوں میں بھوگ چڑھاتی۔ اس کے پتی یعنی راجہ کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک دفعہ کرودھ میں آ کر اس نے پوجا کے کمرے میں جوتوں سمیت پرویش کیا اور پرشاد کی تھالی کو اپنے جوتے سے ٹھوکر ماردی۔ اس کی بیوی لاچار سب کچھ دیکھتی رہی مگر من ہی من میں دیوی ماں سے پرارتھنا کرتی رہی کہ اس کے پتی کو معاف کر دے۔

ہونی تو خیر ہو کر ہی رہتی ہے۔ یکے بعد دیگرے ان پر اتنی ساری مصیبتیں آن پڑیں کہ راج پاٹھ چھن گیا، اسے ملک بدر ہونا پڑا اور پڑوسی دیس میں بھیس بدل کر مزدوری کرنا پڑی۔ اس کی بیوی گھر گھر کام کرنے لگی۔ ایک دن جہاں وہ کام کرتی تھی وہاں پر 'پَن' کی پوجا ہو رہی تھی۔ وہ چپ چاپ

دیکھتی رہی اوراس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ من ہی من میں اس نے پھر سے 'پَن' دینے کاارادہ کرلیا۔وہ جہاں بھی کام کرتی وہاں سے تھوڑے بہت گیہوں کے دانے اکٹھا کر کے لاتی حتیٰ کہ مویشیوں کے چارے میں سے بھی دانوں کوڈھونڈ نکالتی۔کافی دنوں کے بعدوہ پاؤ بھر گندم جمع کرسکی۔اس نے گندم کوپیس کرروٹ بنایااور دیوی ماں کی بھینٹ چڑھایا۔

پھر کیا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے ساری کایاپلٹ گئی۔ادھر اصلی راجیہ میں لوگوں کومعلوم ہوا کہ راجہ کے خلاف سازش کی گئی تھی اور وہ نردوش ہے۔ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں راجہ مزدوری کرر ہا تھا۔انہوں نے اپنے راجہ کوپہچان لیااوراس کواپنے ساتھ لے گئے۔اس طرح وہ پھر سے راجہ بن گیااوراس پریوار کی ساری مصیبتیں دور ہوگئیں۔اس کے بعدراجہ کی بیوی ہرسال 'پَن' کا تہوارمناتی رہی اور راجہ خود بھی اس پوجا میں شریک ہوتا رہا۔

اب دیوی ماں سے یہی پرارتھنا کروکہ اے ماں جیسے تم نے اس گھر کے سارے کشٹ مٹادیے اوران کوساری خوشیاں لوٹادیں ویسے ہی ہمارے کشٹ بھی دورکرلواورہمیں سکھ اورشانتی دو۔''

وہاں کی بات تو خیرا لگ تھی۔راجہ تو ملحد تھا،لیکن یہاں،اس گھر میں نہ کوئی ناستک رہتا تھااور نہ ہی کسی نے پوجا کے دوران ایسی کوئی حرکت کی تھی جودیوی ماں کے شایانِ شان نہ ہو۔پھر یہ ناگہانی آفت کیوں؟ یہ کیسا عجیب سااتفاق تھا کہ دیوی ماں کا پرشاد آج ایک بھوکے پیاسے خونخوار جنگجو کی بھوک مٹانے کے کام آیا۔وہ شکم سیر ہوکر پھراپنے آپ سے بے خبر سوگیا۔

صبح ہونے سے پہلے ہی اس نے مکان میں رکھے ہوئے ٹرنکوں،اٹیچی کیسوں،صندوقوں اور الماریوں کی تلاشی لی۔چنانچہ اسے صرف روپے پیسےاورزیورات کی طلب تھی اس لیے کچھ بھی نہ ہاتھ لگا۔اس نے ایک بار پھر گھر والوں کوایک موٹی سی گالی دی اوراپنی مہم پر چل پڑا۔

گالی مکان میں بہت دنوں تک صدائے بازگشت بن کررہ گئی۔

دوسرے دن سیکورٹی فورسز کوخبر ملی کہ ایک خونخوار آتنک وادی نے اس مکان میں پناہ لی ہے۔

ان کے شک کو تقویت تب ملی جب انھوں نے کُنڈے میں ٹوٹا ہوا تالا دیکھ لیا۔ انھوں نے مکان کا محاصرہ کیا، گولیاں چلائیں، گولے برسائے، آتنک وادی کو بار بار للکارا اور جب کوئی مکافاتی کارروائی نہ ہوئی تو چار جوان اندر گھس گئے۔ بے بس مکان گولی باری سے چھلنی ہو گیا مگر بے زبانی کی وجہ سے کچھ بول نہ سکا۔ وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ انھیں حیرانی بھی ہوئی اور شدید غصہ بھی آیا۔

''سر، یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔'' ایک سپاہی نے صوبیدار کو رپورٹ دی۔

''سالا، چھپ گیا ہوگا کہیں۔ پورا چیکنگ کرو۔ بھاگنے نہ پائے۔'' صوبیدار نے کرخت آواز میں حکم دیا۔

انھوں نے سارے مکان کی تلاشی لی۔ سبھی ٹرنکوں، صندوقوں اور اٹیچی کیسوں کو الٹا پلٹا۔ ان میں سے لیڈیز ساڑیاں ایسے برآمد ہو رہی تھیں جیسے ذبح ہو رہے بکرے سے انتڑیاں نکل کر باہر آ رہی ہوں۔ سارے کمرے میں گرم کپڑے، سوئیٹر، بچوں کے یونیفارم، برتن اور دیگر اشیاء جگہ جگہ بکھر گئے۔ جب کہیں کچھ نہ ملا تو طیش میں آ کر انھوں نے فرنیچر اور ٹین کے ٹرنکوں پر تابڑ توڑ ڈنڈے مار کر اپنے غصے کو ٹھنڈا کیا اور پھر مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

اس روز کے بعد مکان میں داخل ہونے کے لیے سارے راستے کھل گئے۔ لوگ ایک دوسرے سے نظریں بچا کر یکے بعد دیگرے اندر گھس جاتے اور مال لوٹ کر واپس چلے آتے۔ پہلی قسط میں بلیک اینڈ وہائٹ ویسٹن ٹی وی، فلپس ٹرانزسٹر، اسٹیل کے برتن اور کپڑے نکالے گئے۔ پھر میز، کرسی، بیڈ، الماری اور دیگر فرنیچر کی کھیپ بھر لی گئی جب تک سارا مکان خالی ہو گیا۔ اس وقت مکان کی حالت ایسی دوشیزہ کی سی لگ رہی تھی جس کو کئی غنڈوں نے ایک ساتھ بلاتکار کیا ہو اور پھر خون میں لت پت اس کے نیم مردہ جسم کو سرِ راہ چھوڑ دیا ہو۔ ایسی لاشیں تو بار بار نوچے جانے کے لیے ہی زندہ رہتی ہیں۔ اور پھر لالچی اور حریص لوگ نہ تو مردے کے کفن کو چھوڑتے ہیں اور نہ ہی ٹھنڈے گوشت کو۔

گومکان میں اب کچھ بھی باقی نہ بچا تھا پھر بھی ایک پڑوسی کی نظریں دیودار سے بنی ہوئی کھڑکیوں اور دروازوں پر پڑیں۔ رات بھر باپ بیٹے ان کھڑکیوں اور دروازوں کو نکالنے میں ایسے جُٹ گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ سورج کی شعائیں نمودار ہونے سے پہلے ہی انھوں نے مکان کو نذرِ آتش کرلیا تا کہ لوگوں پر یہ گماں بھی نہ گزرے کہ مکان کے دروازے اور کھڑکیاں پہلے سے نکالی گئی تھیں۔ بلاتکار کے بعد لاش کو ہوشیاری سے ٹھکانے لگانے میں ہی مجرموں کی خیر ہوتی ہے۔

گردونواح میں رہنے والوں کو جونہی معلوم ہوا کہ مکان جل رہا ہے اور آگ کی لپٹیں بے قابو ہو رہی ہیں انہیں اپنے آشیانوں کی فکر ستانے لگی۔ پانی سے بھری بالٹیاں لے لے کر وہ اپنے گھروں سے باہر نکل گئے اور مشتعل آگ پر پانی چھڑکنے لگے۔ انھیں یہ فکر ستانے لگی کہ کہیں آگ کی لپٹیں ان کے کاشانوں کو خاکستر نہ کردیں۔

مکان جو پہلے ہی سے عریاں ہو چکا تھا کئی گھنٹے آگ کے شعلوں سے جوجھتا رہا۔

شعلے.....! دھواں.....! کوئلہ.......!

آخر کار وہاں رہ گئی راکھ اور چند ٹوٹی پھوٹی کالی بدنما دیواریں جو ابھی بھی اپنی جگہ پر کھڑی تھیں۔ دل پھر بھی ماننے کو تیار نہ تھا کہ اس ذخیرے میں اب کچھ باقی نہ بچا تھا۔ ''کچھ نہ کچھ، کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ آخر اتنے بڑے مکان میں کہیں کوئی چیز تو ہوگی جو کسی کے کام آسکے گی۔'' دل گواہی دیتا۔

ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے ملبے میں پھنسی ٹاٹائین کی جلی ہوئی چادروں کو دیکھ لیا۔ اس نے اپنے دو گبرو بیٹوں کو آواز دی، ساری چادریں اٹھوالیں اور خود اپنی آخرت سنوارنے کی خاطر سجدہ ریز ہوگئی۔ چادریں گاؤ خانہ کی مرمت کے کام آگئیں۔

دوسرے پڑوسی نے بچی کچھی اینٹیں اور پتھر اٹھوا کر اپنے صحن میں چھوٹا سا بیت الخلا بنوایا۔ جو دیواریں ابھی تک کھڑی تھیں ان کو ہتھوڑوں کی ضربوں نے پسپا کردیا۔ چند روز بعد ایک بیوہ وہاں

سے گزری۔اس کی نظریں ملبے پر پڑیں۔ جابجا ادھ جلی لکڑیاں اور کوئلے دکھائی دے رہے تھے۔اس کو پچھلے سال کی سردیاں یاد آئیں۔سوچتے ہی سارے بدن میں کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔اس نے آنے والے جاڑے کے لیے سبھی اُدھ جلی لکڑیاں اور کوئلے بوریوں میں بھر دیے اور اپنے گھر لے گئی۔

مکان کی جگہ اب صرف ملبہ رہ گیا تھا۔ پاس پڑوس کے بچوں نے اسے کھیل کا میدان بنالیا۔ ہر روز اسکول سے واپس آ کر اپنی گود میں بَیٹ اور وِکٹیں اٹھائے چلے آتے اور پھر کرکٹ کا میچ شروع ہو جاتا۔

ایک روز حسب معمول چار لڑکے آئے۔ایک لڑکا وِکٹیں گاڑنے لگا۔وِکٹ زمین میں گھس نہیں رہی تھی۔اندر کوئی چیز اٹک رہی تھی۔اس نے اپنا سر جھکا کر چھید کے اندر دیکھا۔کوئی چمکیلی شئے تھی۔ وہ بہت خوش ہوا۔دریں اثنا باقی تینوں لڑکے اس کے اردگرد جمع ہوگئے۔انھوں نے بھی باری باری چھید کے ساتھ اپنی آنکھ لگائی اور پھر سر اٹھا کر خوشی کا اظہار کیا۔

''ہو نہ ہو،سونے کا زیور ہے۔'' ہر ایک کے من میں یہی خیال آیا لیکن کسی نے زبان پر بات نہ لائی۔

پہلے لڑکے نے وِکٹ سے کھودنا شروع کر دیا۔دوسرا لڑکا دوڑ کر اپنے گھر سے آہنی اوزار لے کر آ گیا۔ پہلا لڑکا کھودتا رہا جبکہ باقی تین لڑکے مبہوت کھڑے اپنے دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ کوئی قیمتی زیور برآمد ہو۔کھدائی مکمل ہوگئی۔قریب تھا کہ پہلا لڑکا اپنا ہاتھ سوراخ میں ڈال دیتا کہ دوسرے لڑکے نے کشمیری زبان میں آواز دی۔''اڑس...اڑس...مطلب یہ کہ میں بھی برابر کا شریک ہوں۔''

''اڑس...اڑس۔'' تیسرے اور چوتھے لڑکے نے بھی سُر میں سُر ملایا اور دفینے کا انتظار کرتے رہے۔

پہلے لڑکے نے اپنا ہاتھ اندر ڈال دیا اور ٹٹول کر کوئی چیز باہر نکالی۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کا وہی تالا تھا جو کبھی صدر دروازے کا نگہبان تھا۔ سبھی چہرے یکا یک مرجھا گئے۔ تاہم چاروں لڑکے تالے کو لے کر بازار چلے گئے۔ کباڑیے سے مول تول کی اور آخر کار چار روپے کا سودا طے ہوا۔

ایک ایک روپیہ اپنی جیب میں ٹھونس کر سبھی لڑکے خوشی خوشی گھر لوٹ آئے۔

☆☆☆☆☆

ٹگ شاپ

تین مہینے پہلے میں نے ماڈرن اسکول کے پرنسپل کی کرسی سنبھالی۔اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ برسوں سے اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے خوابوں کی تعبیر کا وقت اب آچکا ہے۔امیدوں کے دیئے پھر سے روشن ہونے لگے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ میں کون ہوں؟غلطی دراصل میری ہے۔ مجھے ابتدا ہی میں اپنا تعارف کرانا چاہیے تھا ورنہ آپ مجھے کیسے پہچان سکتے ہیں۔

دنیا کی اس بھیڑ میں اپنی شناخت قائم کرنا بہت مشکل کام ہے۔اس لیے ہر وہ شخص جو اپنی پہچان بنانا چاہتا ہے کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔کوئی بھی کام، چاہے وہ بُرا ہو یا بھلا، مگر دوسرے لوگوں سے ہٹ کر ہو۔

شناخت بنانے میں عمریں گزر جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں کو شناختی کارڈ ورثے میں مل جاتے ہیں، کچھ لوگ انہیں حاصل کرنے کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں اور کچھ لوگ ساری عمر شناختی کارڈ بنوانے کی غرض سے لائنوں میں کھڑے رہتے ہیں مگر آخری دم تک انہیں شناختی کارڈ نصیب نہیں ہوتے۔

اپنے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ میں آپ جیسا ہی ایک انسان ہوں جس نے ایک غریب گھرانے میں جنم لیا تھا۔بچپن میں دھول سے اٹی ہوئی سڑکوں پر گلی ڈنڈا اور کرکٹ کھیلتا رہا۔ پھٹے پرانے بستے میں بھاری بھرکم سیکنڈ ہینڈ بوسیدہ کتابیں ڈھوتا رہا جنھیں اسکول میں گرد آلود بنچوں پر پڑھتا رہا۔طالب علمی کے دوران میں وظیفے اور بُک ایڈ سے استفادہ کرتا رہا مگر تخیل کی ڈور گاندھی،

ٹیگور، ابراہم لنکن اور میڈم کیوری جیسی عظیم ہستیوں سے جڑی رہی۔ ان کی زندگیوں سے متاثر ہو کر خوابوں کی ایک حسین دنیا سجا تا رہا۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد مشاہدہ نفس کیا۔ ہم عصر زندگی کی تگ و دو سے طبعیت میل نہیں کھائی۔ اس لیے پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی۔ یہاں معصوم ننھے منے ذہنوں میں روشنی کی قندیلیں جلاتا رہا۔ آج میرے طالب علم نہ صرف ہندوستان میں بلکہ یوروپ اور امریکہ میں بھی پھیل چکے ہیں۔ انجینئر، ڈاکٹر، سائنسدان اور انفارمیشن ٹکنالوجسٹ۔ میرے طالب علم بے شمار میدان مار چکے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انھوں نے اپنے ماحول سے سمجھوتا کر لیا۔ گاندھی اور ٹیگور سے دور کا واسطہ بھی نہ رکھا۔

عینیت پسند ہونا بھی مصیبت ہے۔ عمر بھر اپنی ہی دنیا میں جیتے رہو۔ اپنے طرز کے مینار کھڑے کرتے رہو۔ یونہی ساری عمر بیت جاتی ہے۔ میرا حال جنگلی موروں سے کچھ کم نہیں۔ وہ بھی کالی گھٹاؤں کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ جب میگھ چھا جاتے ہیں تو جھوم اٹھتے ہیں۔ مدہوش ہو کر ناچتے ہیں مگر جونہی ان کی نظر اپنی بدنما کمزور ٹانگوں پر پڑتی ہے تو ان کے جسم اینٹھ جاتے ہیں۔ ایسی ہی حالت میری بھی ہے۔ عمر بھر میری یہی خواہش رہی کہ کسی اسکول کا انتظام میرے ہاتھ میں آ جائے تو میں اس کی کایا پلٹ کر دوں گا۔ ایسا کروں گا... پھر ویسا کروں گا۔ میرے اسکول سے روبوٹ نکلیں گے نہ توتے۔ خالص روشن خیال انسان برآمد ہوں گے۔ انسان.... جو اس کائنات کو چار چاند لگائیں گے۔

اسی تر ذد میں بیس سال گزر گئے۔ دریں اثنا میں نے ٹنوں چاک بورڈ پر گھسا ہوگا۔ اب جبکہ ماڈرن اسکول کا انتظام مجھے سونپا گیا ہے میں گھبرا رہا ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہی نہیں رہا۔

میں ہمیشہ جمہوری طرز نظام کا معتقد رہا ہوں۔ ابتدا میں اسکول کے حالات کا جائزہ لینا ضروری تھا، سو میں نے لے لیا۔ پھر انتظامیہ میں طلبہ کی شرکت کا خاکہ مرتب کیا۔ اس کے بعد ایک کمیٹی تشکیل دی جو اساتذہ اور طلبہ پر مبنی تھی۔ اس کمیٹی کا کام اسکول کے مسئلوں کا حل ڈھونڈ نکالنا اور

اس پرعمل کرنا تھا۔ ترقی پسند طلبہ نے ان انتہا پسند تبدیلیوں کا کھلے دل سے سواگت کیا جبکہ رجعت پسند اساتذہ نے بالواسطہ طور پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

ایک روز طلبہ نے اسکول میں ٹک شاپ کھولنے کا مطالبہ میرے سامنے پیش کیا۔ مطالبہ بڑا نہیں تھا البتہ مجھے اس بارے میں کچھ پس و پیش تھی۔ اس مطالبے کو منوانے کے لیے اسٹوڈنٹ لیڈر کرشن سچدیو نے کئی بار میرے ساتھ ملاقات کی مگر میں ہر بار سنی ان سنی کر دیتا۔ اس کے دل میں اندیشے گھر کرنے لگے۔ میں جتنا ٹالتا رہا وہ اتنا ہی اصرار کرنے لگا۔ شاید اب اس نے اس معاملے کو پرسٹیج ایشو بنالیا تھا۔

انسانی جستجو کی یہ ایک انوکھی صداقت ہے کہ اسے جو چیز نہیں ملتی وہ اس کی خاطر آتش زیر پا رہتا ہے۔

حیرت تو اس بات کی تھی کہ طلبہ کو ٹک شاپ کھلوانے کے علاوہ اب کوئی مسئلہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ میرے اخلاص اور میری نیکیوں کو بھول گئے۔ ان کے دل میں اب صرف ایک ہی کانٹے کی چبھن تھی اور وہ تھی ٹک شاپ کی درخواست پر دیر ہونے کی۔

مہینہ بھر انتظار کرنے کے بعد کرشن سچدیو میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ ''مے آئی کم ان سر''

''یس کم ان''

وہ اندر آ گیا۔ اس کی آنکھیں خشمناک تھیں۔ کرشن سچدیو اجازت مانگے بغیر ہی کرسی پر بیٹھ گیا تاہم مودبانہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''سر، ہم نے ایک چھوٹی سی گزارش کی تھی اور وہ بھی آپ پوری نہیں کر پا رہے ہیں۔ آپ سے تو ہماری اتنی ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ تو ہمارے لیے بھگوان سمان ہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے اگر ٹک شاپ نہیں کھلے گا تو پھر کبھی بھی نہ کھلے گا۔''

اپنی تعریفیں سن کر میرے بدن میں گدگدی سی ہونے لگی۔ میں من ہی من میں سوچنے لگا۔ ''یہ

لوگ تو مجھے اپنا بھگوان سمجھتے ہیں۔ مطلب انھیں یہ معلوم ہے کہ میرے بغیر یہ اسکول ترقی نہیں کرسکتا۔ کتنے قدرداں ہیں یہ بچے! مجھے اپنے تجربوں پر پہلے ہی سے مکمل بھروسہ تھا ورنہ طلبہ کسی کے بھی نہیں ہوتے۔ منہ پر کھری کھری سناتے ہیں۔ غرض انھیں اس بات کا احساس ہے کہ مجھ سے پہلے اس کرسی پر جولوگ براجمان رہے وہ بے فیض و بے اعتنا تھے۔ ان کا نہ تو کوئی منصب تھا اور نہ ہی کوئی منزل۔ محض اپنا پیٹ پالنے کے لیے وہ اس کرسی کے ساتھ چپکے رہے۔ مگر میں نے اس اسکول کو ایک نئ دِشا دی۔ ایک نئ بصارت بخشی۔

اس دوران کرشن سچدیو بہت کچھ کہہ چکا تھا۔ وہ مجھے سمجھا تا رہا تھا کہ اسکول میں ٹک شاپ کا ہونا کتنا ضروری ہے مگر میں اس کی طرف دھیان دیے بغیر ہی اپنے خیالوں کی دنیا میں گم رہا۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ مسکہ لگا رہا تھا یا سچ بول رہا تھا۔ اس کی باتوں سے بظاہر خلوص ٹپک رہا تھا البتہ باطن کی خبر اس کے سوا کسی کو نہ تھی۔

''سر آپ نے ہمارے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس اسکول کو نئی جہت عطا کی۔ پھر یہ تو ایک چھوٹی سی مانگ ہے۔ آپ اس کو منظور کرنے سے کیوں کتراتے ہیں؟''

وہ میری دبدھا کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ میرے لیے اگر یہ معمولی سی بات ہوتی تو میں نے کب کی منظوری دی ہوتی۔ میں اسے سب کچھ بتانا چاہتا تھا مگر ہمت جواب دے رہی تھی۔ وہ میرے خدشات کو یہ کہہ کر رد کر دیتا کہ آخر آپ کے ساتھ ماضی میں جو کچھ ہوا ہے یہ ضروری نہیں کہ اب بھی وہی ہوگا اور اس طرح میں لاجواب ہو جاتا۔ میں کچھ بھی طے نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے روکھائی سے جواب دیا۔ ''مجھے اس بارے میں تھوڑی اور مہلت چاہیے۔''

سچدیو کے چہرے پر استعجاب اور بے بسی کی شکنیں نمودار ہوئیں۔ میں اس کو سمجھانے کے لیے ابھی اپنے آپ کو تیار ہی کر رہا تھا کہ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

کمرے میں میں اور میرا بیتا ہوا کل رہ گیا۔ دونوں میں مکالمہ شروع ہوا۔ میرے سنکوچ کی

جڑیں طالب علمی کے زمانے میں پیوست تھیں۔

جہلم کے کنارے ایک چھوٹا سا گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول تھا جہاں میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اسکول کے وسیع وعریض احاطے میں تین لمبی بدشکل بارکیں ایک دوسرے کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کررہی تھیں۔ ایک روز دعائیہ مجلس کے دوران پرنسپل صاحب نے اعلان کیا کہ وہ اسکول میں ٹک شاپ کھلوا رہے ہیں۔ پورے مجمعے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کمرہ مختص ہوا۔ کنٹریکٹر کا انتخاب ہوا۔ دیکھ ریکھ اور معائنہ کا کام ڈرل ماسٹر کو سونپا گیا۔ صاف وشفاف میز اور کرسیاں، بے داغ کپ اور گلاس، تازہ چائے اور ناشتے کا سامان ٹک شاپ میں سجایا گیا۔ پروسنے کے لیے سترہ سال کے دو چھوکرے مقرر ہوئے۔

پہلے پہل آدھی چھٹی کے وقت کینٹین کے اردگرد اسٹوڈنٹس کا ایک ہجوم سا دکھائی دیتا مگر آہستہ آہستہ اپنے دیش کی روایت کے عین مطابق ابتری آنے لگی۔ شیلفوں پر اجلی کراکری کی جگہ ٹوٹے پھوٹے غلیظ اور گندے پیالے اور گلاس دکھائی دیتے۔ کھانے کے لیے اب باسی ڈبل روٹیاں ، بدبودار تیل میں تلے ہوئے بیسن کے پکوڑے، صحت شکن ٹافیاں اور مکھیوں سے گھری ہوئی سستی مٹھائیاں دستیاب رہتیں۔ اس کینٹین کو دیکھتے ہی جی متلانے لگتا۔ پہلے کی مانند نہ تو خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی اور نہ ہی شیلفوں پر سامان بکتا۔

مجھے اس بات کا تعجب ہورہا تھا کہ یہ ٹک شاپ کیسے چل رہا ہے؟ اس کے مالک کا گزارہ کیسے ہو رہا ہے؟ چھان بین کرنے پر معلوم ہوا کہ اب یہ ٹک شاپ مخصوص طلبہ کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ عام طلبہ تو اس کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتے۔ کینٹین کے اندر جوگیوں کی دھونی جگی رہتی۔ کچھ سرپھرے ایسے بھی تھے جو اپنے سگریٹوں کا تمباکو نکال کر ان میں چرس بھر کر پیتے۔ یہ سب اشیاء ٹک شاپ کا مالک مہیا کرتا۔ باسی مٹھائیاں اور کراکری تو محض مکھوٹے بن کر رہ گئے۔ طلبہ تو طلبہ، کئی اساتذہ بھی اپنے کلاسوں کا ناغہ کرکے زیادہ تر وقت ٹک شاپ میں ہی گذارتے۔ اس مخصوص گروہ کی اچھی خاصی

آمد ورفت رہتی۔ گو اساتذہ اور طلبہ ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے تاہم کبھی کبھار کوئی ترقی پسند استاد ان حدوں کو پھلانگ کر طلبہ کے بیچ میں جا بیٹھتا۔ عصری سیاست پر بحث چھیڑتا اور اس طرح اپنی فکرو دانش کی دھاک بٹھانے کی ناکام کوشش کرتا۔ ادھر ڈرل ماسٹر کا یہ حال تھا کہ وہ اب معائنہ کے بجائے صرف ہفتہ وصول کرنے کی غرض سے چلا آتا۔

پھر ایک دن سارے اسکول میں سنسنی پھیل گئی۔ دسویں جماعت کے ایک طالب علم نے چرس پی کر اسکول کی چار دیواری سے دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔ اپنے اعضاء پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے وہ ڈوب گیا تھا۔ دوسرے روز اسکول کھلتے ہی پرنسپل صاحب نے اس کے ڈوب جانے کی المناک خبر سب کو سنائی۔ خبر سناتے وقت ان کی آنکھوں میں بے شمار آنسو امڈ پڑے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں پائے۔ اسی روز ٹک شاپ بند کر دیا گیا۔

اتنے سالوں بعد میں بھی پرنسپل کی جگہ پر کھڑا اپنے ماضی سے ہم کلام تھا۔ اس سانحہ کا خیال آتے ہی میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو دبا نہ سکا۔ اگلے روز میں نے اسٹاف میٹنگ بلوائی اور اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”میرے اسکول میں ٹک شاپ نہیں کھلے گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

سبھی اساتذہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔ یہ بات سارے اسکول میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ اساتذہ نے لیڈروں کو اور لیڈروں نے طلبہ کو بھڑکایا۔ رہی سہی کسر سیاسی جماعتوں نے پوری کر دی۔ انھوں نے جلتی پر تیل چھڑکا۔

پھر ہڑتالیں شروع ہوئیں۔ جلسے جلوس منعقد ہوئے۔ وہ اساتذہ، جو مجھ سے اس بات پر خفا تھے کیونکہ میں نے اسکول میں جمہوری نظام کی بنیاد ڈالی تھی جس میں وہ اپنی رسوائی سمجھتے تھے، مورچہ بندی پر اتر آئے۔

بات حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ منیجمنٹ نے اسکول کو عارضی طور پر بند کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ وہ مجھ

سے ناراض ہوئے اور مجھے نااہل قرار دیا گیا۔

میں نے اسکول جانا ترک کر دیا اور اپنا استعفیٰ مینجنگ بورڈ کو بھیج دیا۔ دریں اثنا بورڈ اور طلبہ کے بیچ مذاکرات ہوئے۔ ٹک شاپ کھولنے کا مطالبہ انتظامیہ نے مان لیا۔ اسکول پھر سے کھل گیا اور وائس پرنسپل کو میرا چارج سنبھالنے کا حکم ہوا۔

دس دن بعد میں اپنا چارج سونپنے کے لیے اسکول چلا گیا۔ چارج دے کر جب میں کمرے سے باہر نکلا وہاں کوئی مکھی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ چہار سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سبھی لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔

میں اکیلا، بالکل اکیلا، بوجھل قدموں سے گیٹ کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ گیٹ کے قریب میں نے مڑ کر ڈبڈبائی آنکھوں سے اس ادارے کو جی بھر کر دیکھ لیا جس کی تعمیر کے سپنے اپنی نگاہوں میں سالہا سال سے سجائے تھے۔

گیٹ سے باہر نکلتے ہی میں بھیڑ میں گم ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ یکا یک سامنے سے گیارہویں جماعت کا ایک شرمیلا طالب علم نمودار ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ وہی لڑکا ہے جس نے پچھلے سال بورڈ کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ وہ چھپتا چھپاتا سہما سہما میرے قریب آیا۔ پھر اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور اپنی جیب سے ایک خوبصورت سرخ گلاب نکال کر پوری عقیدت کے ساتھ مجھے پیش کیا۔

میں نے سر سے پیر تک اس لڑکے کا جائزہ لیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ کچھ کہنے کی ہمت بھی جٹا نہ پا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور پھر برق رفتاری سے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

اس کی پُر خلوص عقیدت مند نگاہیں میرے ڈوبتے ہوئے دل کو تسلّی دینے کے لیے کافی تھیں۔

☆☆☆☆☆

چنار کے نیچے

دس سال بعد میں پھر اُسی وادی میں لوٹ آیا ہوں جہاں میری زندگی پروان چڑھی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس بار میں اپنی ہی دھرتی کی کھوج میں ایک غریب الوطن کے روپ میں وارد ہو چکا ہوں۔

دھرتی اجنبی لگ رہی ہے۔ لوگ اجنبی لگ رہے ہیں۔ دھرتی جب پرائی ہو جاتی ہے تو سب کچھ اجنبی سا لگتا ہے۔

موسم بھی اکھڑا اکھڑا سا ہے۔ شاید میری کیفیت سے ہمدردی جتا رہا ہے۔ بے موسم کا مسافر اپنے آپ کو ہمیشہ الگ تھلگ پاتا ہے۔ موسم بہار میں اس گلپوش وادی میں گھومنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ سرمئی نیلاہٹ لیے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ، کلغیاں پہنے ہوئے قلۂ کوہ اور سبزے کی چادر اوڑھے ہوئے دامنِ کوہسار۔ جدھر دیکھو ادھر پھولوں کے تختے اور پھر چناروں کے سائے میں ستانے کی للک۔ یہی خواب کھینچ کر لائے تھے مجھے۔ لیکن یہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔

چناروں کے پتّے سب کے سب زرد پڑ چکے تھے۔ اکثر و بیشتر شاخوں سے کٹ کر زمین پر بکھر چکے تھے گو چند ایک ابھی بھی اپنی شاخوں سے لٹک رہے تھے۔ ان تناور درختوں کو انہی پتوں نے سال بھر اپنا خون جگر پلایا تھا۔ بدلے میں اب ان کا دانہ پانی بند ہو چکا تھا۔ پیڑوں نے یہ اقدامات آنے والے موسم سرما سے محفوظ رہنے کے لیے کیے تھے جن میں یہ کارروائی بھی شامل تھی۔ ہاں یہ بات اور تھی کہ پیڑوں کی نشوونما میں ان پتّوں کا سب سے زیادہ یوگدان رہا تھا۔ اب تک ان کی ساری رنگت اڑ چکی تھی۔ وہ اس گھڑی کا انتظار کر رہے تھے جب کوئی ہوا کا جھونکا انھیں اپنے مسکن سے جدا کر لیتا۔

جن دنوں میں یہاں رہتا تھا خزاں کے موسم میں چنار کا یہی حال ہوتا۔ البتہ ان دنوں میں چنار

کے پتوں کا اس سنجیدگی سے مشاہدہ نہیں کرتا تھا۔ میں اسے فطری عمل سمجھ کر نظر انداز کرتا۔ آج نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس مظہرِ قدرت میں کوئی گہرا بھید پوشیدہ ہے۔

دل کی کیفیت اور ماحول کی کیفیت ایک جیسی ہو تو قدرت کے راز انسان پر خود ہی آشکار ہوتے ہیں۔

تانبے کی رنگت لیے ہوئے بے شمار برگِ خزاں آج میرے وجود کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ یرقان زدہ پیلے پنجے جن پر ٹیڑھی میڑھی انگلیاں اُگ آئی ہیں۔ انگلیوں کی رگیں بھی صاف صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ نیچے میرے قدموں تلے سوکھے مردہ پتے چرمرا رہے ہیں۔ سسک رہے ہیں ۔کراہ رہے ہیں۔ اس چرمراہٹ سے میں بچپن میں بہت مسرور ہوتا تھا مگر اب اس آہ و بکا سے کوفت ہوتی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک زوردار ہوا کا جھونکا آیا۔ چنار کے درخت سے ایک اور زرد پتہ ٹوٹ کر میرے منہ سے لپٹ گیا۔ ٹھٹھک کر میں نے پتے کو اپنے داہنے ہاتھ سے پکڑ لیا اور اسے گھورتا رہا۔

کہیں دور سے کوئی کرخت آواز آئی۔ شاید کسی بادل کی گرج تھی۔ گھبراہٹ کے سبب میرے سارے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔ چنار کے پتے کو اچانک زبان مل گئی۔ ''گھبراؤ مت دوست! میں ہر روز یہ گھن گھرج سنتا تھا۔ جب گردوں پر کالے بادل منڈلاتے تھے، جب آندھیاں خاک اڑاتی تھیں اور جب بجلیاں کڑکتی تھیں، اس وقت میں اپنی شاخ سے لپٹا ان ناسازگار حالات کا مقابلہ کرتا تھا اور کبھی گھبراتا نہیں تھا۔ کبھی آسماں سے مسلسل پانی کی چادریں برستی تھیں تب بھی میں پریشان نہیں ہوا۔ بس سورج نکلنے کا انتظار کرتا۔ وہ جلوہ افروز ہوتا تو میں اپنی لے میں آکر پھر سے جھومنے لگتا۔ میرے اندر کی ساری کلیں جاگ اٹھتیں۔''

''اس درخت کے لیے تم نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ رات دن ایک کر کے اس کو حیات بخشی۔ پھر تمہارا یہ حشر کیوں؟'' اضطرار کے باعث میں نے دبی زبان میں استفسار کیا۔

''میرے دوست، اسی کو کہتے ہیں زندگی۔ اس تناور درخت کے لیے میں نے رات کی نینداور دن کا چین گنوایا۔ بدلے میں کیا حاصل ہوا۔ نا کہ بندی........ گھٹن ....اور.....بے گھری.....!''

''پھر بھی تمھیں اس کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔''

''جب اپنوں پر سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے تو ایسی صورت حال میں جدائی سے بہتر کوئی علاج نہیں ہوتا۔''

زرد پتہ مجھے ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ وہ زمان ومکان کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اپنی جیب میں محفوظ رکھا۔

ادھر آسمان کو بادلوں نے ڈھک لیا تھا۔ ٹھنڈی برفیلی ہوائیں نشتروں کی مانند میرے سارے بدن میں چبھنے لگی تھیں۔ ادھر وقت بے صوت وصدا شترمرغ کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔

مجھے اس موسم میں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آخر ہے کیا یہاں؟ ویرانی.......چاروں جانب ویرانی.....! آنے والی سردیوں کے تصور سے ہی مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ خدا جانے سردیوں میں مغربی ممالک سے یہ سیلانی یہاں کیوں آتے ہیں؟ ان یخ بستہ مناظر میں ایسی کونسی دلکشی ہے جو انھیں یہاں کھینچ لاتی ہے؟ ہزاروں میلوں کا سفر طے کر کے چلے آتے ہیں یہ لوگ۔ اس وادی کو برف میں ملفوف دیکھنے کے لیے۔

برف سے ڈھکی ہوئی وادی.......! خاموش......! یخ بستہ.......! خواب آلود.......!

موسم سرما میں برف کی چادر مجھے کفن سے کچھ کم نہیں لگتی۔ ساری وادی پر قبرستان کی خاموشی چھا جاتی ہے۔ خوفزدہ لوگ ان برف کی دبیز تہوں کے نیچے ٹھٹھرتے رہتے ہیں۔ دروازوں پر چٹخنیاں لگا کر اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہیں۔ بند کھڑکیوں کے پیچھے سسکتے رہتے ہیں۔ ہوا کے جھونکوں کو بھی اندر آنے نہیں دیتے۔ ڈرتے ہیں کہیں کوئی جھونکا انھیں اپنے ساتھ اڑا نہ لے۔ وہ محض اس امید پر جیتے ہیں کہ دیر سویر کبھی تو بہار آئے گی۔ امید زندگی کی افیم ہے۔

یہ ولائتی سیلانی بھی عجیب قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ نامساعد حالات میں بھی انھیں زندگی کے مزے لوٹنے کا ہنر آتا ہے۔

میری جیب میں زرد پتہ تڑپ اٹھا۔ میں اس کے اضطرار میں برابر کا شریک ہوں۔

''دوست! تم نے اخباروں میں پڑا ہی ہوگا۔ یہاں ہر سال دریا میں طغیانی آتی رہی۔ بے شمار گھر اجڑ گئے۔ ان گنت پودے اپنی دھرتی سے اکھڑ گئے۔ پانی کے ریلوں کے ساتھ بہتے چلے گئے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ دل سوز مناظر دیکھے۔ وہ جڑوں سمیت اکھڑتے چلے گئے اور جو ایک بار اپنی مٹی سے اکھڑ جاتا ہے وہ اُس دھرتی پر دوبارہ جڑ نہیں پکڑ سکتا۔''

''یہ چنار تو ایستادہ ہے۔ یہ بھی ان آندھی طوفانوں سے جوجھتا رہا ہوگا۔'' میں نے سوال پوچھا۔

''تمھاری بات سولہ آنے سچ ہے میرے دوست۔ یہ چنار آئے دن آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس کے باوجود اپنی زمین پر ڈٹا رہا۔ لیکن اس کی بات ہی کچھ اور ہے۔'' زرد پتہ کانپ اٹھا۔

''جو پیڑ اکھڑ گئے وہ بھی تو یہ سب اذیتیں جھیل سکتے تھے۔ انھوں نے طغیانیوں کا مقابلہ کیوں نہیں کیا؟'' میں نے پھر سوال پوچھا۔

''تم بیوقوف ہو۔ نرے احمق ہو۔ اذیتیں برداشت کرنے کے لیے حوصلہ ہی کافی نہیں ہوتا۔ مضبوطی، تنومندی اور وسائل بھی درکار ہوتے ہیں۔ اس برے وقت کو عبور کرنے کے لیے چنار کے درخت کی جڑیں اپنی گہرائی اور مضبوطی کا فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔ ان کو اکھاڑ پھینکنا بعید از قیاس ہے۔ بہر حال چھوٹے چھوٹے پیڑ پودوں سے ایسی توقع رکھنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ وہ طغیانی کیا، تیز ہواؤں کی بھی تاب نہیں لا سکتے تھے۔ اس پر طرّہ یہ کہ زمین نے بھی ان کا ساتھ نہ دیا۔ زمین، جو ان کا آخری سہارا تھی، خود بھی دریا کی موجوں کے ہمراہ بہتی چلی گئی اور ساتھ میں ان پیڑ پودوں کی جڑیں

بھی اکھاڑتی چلی گئی۔''

''یہ چنار بھی بے برگ ہو چکا ہے۔اس پر بھی خزاں آچکی ہے۔'' میرے دل میں نہ جانے کیسے یہ خیال پیدا ہوا۔

''تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ موسم بدلتے رہتے ہیں اور سردی کے بعد بہار ضرور آتی ہے۔تب اس چنار میں نئی نئی کونپلیں پھوٹیں گی۔یہ پھر ہرا بھرا ہو جائے گا۔جاڑے کی اذیتیں بہر حال اٹھانا ہی پڑیں گی۔مگر بہار کبھی نہ کبھی ضرور آئے گی۔''

چنار کا یہ خزاں رسیدہ درخت اگر زندہ ہے تو امیدِ فردا کے باعث۔امید ہی اس کارخانۂ حیات کی محرک ہے۔وہ جو اکھڑ گئے سو اکھڑ گئے۔ان کی امیدیں مر چکی ہیں......نہیں....ان کی امیدیں بھی برقرار ہیں۔وہ بھی زندہ رہنے کی نئی نئی سبیلیں ڈھونڈ لیں گے۔

جینا ہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔کون کیسے جی لیتا ہے،اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ہاں اتنا ضرور ہے کہ کبھی ڈھنگ سے نہیں جی سکتے۔دھرتی کا پودا دھرتی پر ہی پنپتا ہے۔غربت میں وہ اکثر مرجھاتا ہے۔نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ہمیشہ کے لیے۔اور پھر رہ جاتی ہیں یادیں۔ڈھیر ساری یادیں۔تواریخ کی کتابوں میں مدفن یادیں......فرعونی تہذیب کی یادیں...... یونانی تہذیب کی یادیں۔

یا پھر رہ جاتے ہیں فوسل اور آثار قدیمہ۔ڈائنوسورس (Dinosaurus) اور آرکیوپٹیرکس (Archeopterix)۔اسٹون ہنج (Stonehenge) اور جنتر منتر یا پھر رہ جاتے ہیں لِونگ فوسِل۔گنگو بائلوبا (Ginkgo biloba) اور ہم لوگ جو زندہ لاشوں کی طرح اپنی نسل کو گھسیٹتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

دور کہیں زبردست دھماکہ ہوا۔میرے پاؤں کے نیچے زمین ہل گئی۔جھٹکا اتنا شدید تھا کہ پنچھی بھی اپنے گھونسلوں سے باہر نکل کر واویلا مچانے لگے۔اُدھر کُتے مارے گھبراہٹ کے لگاتار بھونکنے

لگے۔ کچھ وقفے کے بعد فائرنگ کی آوازیں رُک رُک کر میرے کانوں تک آنے لگیں۔

گیسٹ ہاؤس کا کیئر ٹیکر اندر سے دوڑتا ہوا میرے پاس چلا آیا۔ ''شاب، شاب، آپ یہاں کھڑے مت ہو۔ باہر فائر ہوتا ہے۔ سامنے والا بلڈنگ پر میزائل پھٹ گیا۔ شاب، یہاں بہت خطرہ ہے۔ آپ اندر گیسٹ ہاؤس میں چلو۔''

میں اپنی جان بچانے کے لیے گیسٹ ہاؤس کے اندر گھس گیا۔ ہمت بٹور کر میں نے اپنی پائپ سلگائی اور دھوئیں کے چھلے بناتا ہوا سوچ کے سمندر میں غوطے مارنے لگا۔

''آخر کب تک ہم یوں ہی اپنے آپ سے ڈرتے، بھاگتے اور چھپتے پھریں گے۔''

☆☆☆☆☆

موچی پپلا

موچی پپلا میں ایک قبیلا رہتا تھا جو مردہ جانوروں کی کھالیں اتارنے، ان کا چمڑا بنانے اور پھر جوتے سلنے کے لیے مشہور تھا۔ آزادی کے فوراً بعد لیدر پرموشن کونسل کی نگاہیں اس گاؤں پر پڑیں۔ ان دنوں گاندھی جی کی بڑی پرستش کی جاتی تھی خاص کر ان کی جائے پیدائش کے گردونواح میں۔ جگہ جگہ کھادی اور ولیج انڈسٹریز، سودیشی تحریک اور امداد باہمی کی باتیں ہوتی تھیں۔ ان کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے طرح طرح کے تجربے کیے جاتے تھے۔ کونسل نے چمڑے کی صنعت کو بڑھاوا دینے کے لیے موچی پپلا کو ایک ماڈل گاؤں بنانے کا فیصلہ کیا۔

جب کونسل کی ٹیم گاؤں میں پہلی بار آئی ایک پھرتیلے نوجوان نے ان کے پرجوش استقبال کے لیے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ نام تھا خیراتی لال چمڑے والا۔ کونسل کا چیئرمین اس کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوا۔ خیراتی لال کو اپنی برادری اکٹھا کرنے اور ان کو موٹیویٹ کر کے کواپریٹو سوسائٹی بنانے کا کام سونپا گیا۔

تجربہ کامیاب رہا۔ سبھی ممبران منافع میں برابر کے حصہ دار بنے۔ کئی پروڈکشن سنٹر کھل گئے۔ پھر مارکیٹنگ شعبے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں رِٹیل دُکانیں کھولی گئیں۔ جوتوں کی مانگ اتنی بڑھی کہ پیداوار اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ کہاں تو کونسل کی نظریں بیرونی ممالک کے بازاروں پر جمی تھیں اور کہاں ملک کے اندر ہی مانگ پوری نہیں ہو پا رہی تھا۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے کواپریٹو کے انتظامیہ بورڈ کا ہنگامی اجلاس خیراتی لال کی صدارت میں بلایا گیا۔ بورڈ نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ سویڈن سے چمڑا بنانے اور اس کو رنگنے کی مشینیں درآمد کی جائیں گی اور ان کارخانوں میں مقامی نوجوانوں کو ملازمت کے لیے ترجیح

دی جائے گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اب گھروں کے بدلے کارخانوں سے لاکھوں کی تعداد میں جوتے بننے لگے۔ کارخانہ چونکہ خیراتی لال کی انتھک کوششوں کا پھل تھا اس لیے اس کا نام بھی خیراتی لال کوا پریٹو شو فیکٹری رکھا گیا۔

کارخانے کی مشینوں کا انتخاب کرنے کی غرض سے خیراتی لال چمڑا والا کو دو بار سویڈن اور ناروے جانا پڑا مگر وہاں کی ہوا ایسی لگ گئی کہ اپنی چال ہی بھول گیا۔ اسے اب اپنے نام سے کچے چمڑے کی بو آنے لگی اس لیے 'چمڑا والا' کا لاحقہ ہمیشہ کے لیے حذف کر لیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ خیراتی لال کی مالی حالت خوب سے خوب تر ہونے لگی جبکہ گاؤں کے دیگر لوگوں کی حالت میں کوئی زیادہ تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملی۔ البتہ کچھ شاطر لوگوں نے بہتی گنگا میں ہاتھ ضرور دھوڈالے۔ دستکار، خاص کر چمڑا رنگنے والے اور جوتا بنانے والے کاریگر بیکار ہو گئے۔ انہیں آبائی پیشہ چھوڑ کر کارخانوں میں ملازمت کرنا پڑی۔ اس کے باوجود سارا گاؤں خیراتی لال کی جے جے کار کرنے لگا۔ بجلی کی دستیابی، پانی کی فراوانی اور سڑکوں کے جال کو دیکھ کر کون کافر ارتداد کا مرتکب ہونا پسند کرتا۔

حالات کے اس تغیر کے باوجود کلّو اور پارو کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا۔ خیراتی لال کے بڑے بھائی نے جس اُستاد سے جوتے بنانے کا کام سیکھا تھا اسی کے بیٹے کا نام کلّو تھا۔ وہ اپنا اصلی نام 'کلیانی' بھول چکا تھا کیونکہ سبھی لوگ اسے کلّو کے نام ہی سے پکارتے تھے۔ پارو اور کلّو دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ دونوں ایک ساتھ پلے بڑھے، کیری کے باغوں میں لُکا چھپی کھیلتے رہے، چوری چھپے کیریوں کو توڑ کر کھاتے اور اُترائن کے دنوں میں پتنگیں اڑاتے۔ اڑانے سے زیادہ دوسروں کی پتنگیں لوٹتے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا ہمراز بنایا اور کبھی نہ بچھڑنے کی قسمیں کھائیں۔

سارا گاؤں ان کے اس میل جول سے واقف تھا۔اس بارے میں کسی بھی فریق کو کوئی عذر نہ تھا۔کلّو اپنے باپ سے کام سیکھنے لگا کیونکہ پورے گاؤں میں ایک اسی کا باپ تھا جو اس ہنر میں یکتا تھا۔اس نے اپنے بیٹے کو بہترین کاریگری کے سبھی گُر سمجھا دیے۔پھر کلّو اور پارو کے اس رشتے میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔اپنی برادری،اپنی ذات،کماؤ ہنر مند لڑکا،سندر سوشیل لڑکی۔اور کیا چاہیے تھا ان کو!

کلّو بے صبری سے انتظار کرتا رہا اور پارو اس کو دلاسہ دیتی رہی۔

''کلّو تم سمجھتے کیوں نہیں۔پتا جی کے پاس میری شادی کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔وہ دن رات اس کواپریٹو سوسائٹی کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔''

''بھاڑ میں جائے یہ کواپریٹو۔سارے گاؤں کی نیند حرام کر دی ہے اس نے۔جسے دیکھو بس سوسائٹی سوسائٹی کی رٹ لگا رکھی ہے جیسے زندگی میں اس کے سوا اور کوئی کام نہیں۔''

''اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ہو سکتا ہے اسی میں گاؤں کی بھلائی ہو۔''

''پارو،تم اپنی ماں سے کیوں نہیں کہہ دیتی۔''

''کہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔پتا جی جب کان دھریں تب بات بنے۔وہ تو آج کل کسی کی سنتے ہی نہیں۔ماں کی بھی نہیں۔بس کارخانہ....مشینیں....کچا مال....جوتے....صبح سے شام تک کتنے سارے لوگوں کی بھیڑ جمع رہتی ہے ہمارے گھر میں۔''

''وہ تو میں بھی دیکھتا ہوں۔پھر ہم کیا کریں؟ مجھے تو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا ہے۔''

''تھوڑا اور انتظار۔آخر میں ان کی بیٹی ہوں۔ان کو تو اس بات کا احساس ہوگا ہی کہ لڑکی کے ہاتھ پیلے کرنے کا اب وقت آچکا ہے۔''

انتظار....بس انتظار....شبھ لگن کے مہورت کا۔سہرے گھوڑے کا۔ڈھول تاشے کا۔

اور پھر یہی انتظار اتنا مہنگا پڑا کہ سب لوگ دیکھتے ہی رہ گئے۔

خیراتی لال کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ اسمبلی چناؤ کے لیے اس کو منتخب کیا گیا اور وہ ایم ایل اے بن گیا۔ اُس کے ووٹ بنک کو دیکھ کر چیف منسٹر نے اُسے انڈسٹریز منسٹر بنا دیا۔

منسٹر بننے کی دیر تھی کہ صاحب ثروت کے تیور ہی بدل گئے۔ سکونت بدل گئی۔ رہن سہن بدل گیا یہاں تک کی طور وطریق بھی بدل گیا۔ گاندھی نگر میں دو منزلہ کوٹھی خریدی گئی۔ گاؤں میں جائیداد برائے نام اس لیے رکھی تا کہ گاؤں سے جڑے رہیں اور گاؤں والوں پر اپنا اثر ورسوخ برقرار رہے۔ کمسن بچوں کو مقامی کانونٹ میں داخل کروایا گیا جبکہ پارو کے لیے، جو بیس سال کی ہو چکی تھی اور اب اسکول جانے کے قابل نہ رہی تھی، لکھنے پڑھنے کا انتظام گھر ہی میں کروایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی چھوٹی سی کائنات اُلٹ پلٹ ہو گئی۔

شہر میں رہ کر پارو کا حلیہ بھی بدل گیا۔ ہیئر اسٹائلسٹ نے پژمردہ چہرے میں جان پھونک دی۔ میک اپ سے چہرہ نکھر آیا۔ بول چال میں انگریزی الفاظ کا سیلاب در آیا۔ اور پھر چلنے پھرنے کے ڈھنگ میں نزاکت عود کر آ گئی۔

آدمی جتنا بلند ہو جاتا ہے، اس کی پرواز کی حدیں اتنی ہی وسیع ہو جاتی ہیں۔ اس بات کا مظاہرہ آخر کار خیراتی لال نے اپنی بیوی سے کر ہی لیا۔

''مجھے پارو کی بڑی چنتا لگی رہتی ہے۔''

''وہ کیوں.....اس نے تو ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ بے چاری گھر سے باہر قدم بھی نہیں رکھتی۔''

''تم نہیں سمجھوگی۔ گاؤں میں وہ چھوکرا تھا نا۔ وہ.....کیا نام تھا اس کا..... ہاں یاد آیا.....کلّو.....وہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ حرام زادے کو میں نے دو تین بار اس گھر کا طواف کرتے ہوئے دیکھ لیا۔''

''اس میں برائی کی کیا بات ہے جی۔ آخر منگیتر ہے اس کا۔''

''کون سا منگیتر.....کہاں کا منگیتر؟ زرا سا منہ کیا لگایا سر پر چڑھ بیٹھا۔ میں نے کبھی پارو کے لیے اس کو پسند نہیں کیا۔''

''آپ کی پسند ناپسند سے کیا ہوتا ہے۔ سارا گاؤں جانتا ہے۔ دونوں ایک ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اب تو بے کار میں تھو تھو ہوگی۔''

''بھاڑ میں جائے ان کی چاہت۔ پارو کے لیے تو ایک سے بڑھ کر ایک بَر مل رہے ہیں۔ اس لونڈے کی حیثیت ہی کیا ہے جو پارو کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ لے۔ ان پڑھ، گنوار، کم ذات کہیں کا..''

پارو کی ماں چُپ ہوگئی۔ پارو بھی دروازے کی آڑ میں کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔ وہ دم بخود ہوگئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر اُمڈ پڑا۔ قریب تھا کہ اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی کہ وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے روز سے پارو پر کڑی نگرانی رکھی جانے لگی۔ گھر پر جتنے بھی سیکورٹی گارڈ تعینات تھے انہیں خصوصی طور پر ہدایت دی گئی کہ کسی شخص کو صاحب کی اجازت کے بغیر گھر میں داخل نہ ہونے دیا جائے اور اگر پارو یا کوئی اور بچہ باہر گھومنا بھی چاہے تو کوئی آدمی اس کے ساتھ ضرور جائے کیونکہ شہر میں حالات بگڑ چکے ہیں اور دہشت گردوں کی نقل وحرکت سے خطرے کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔

کلّو نے بارہا کوشش کی کہ وہ پارو سے ملے مگر ہر بار گارڈ نے روک لیا۔ ''پاروتی میم صاحب شہر سے باہر چلی گئی ہیں۔''

جذبات سے مشتعل ہو کر کلّو نے اپنے باپ کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ گاؤں چھوڑ کر شہر چلا آیا اور چرمی سامان بنانے والی فیکٹری میں مزدوری کرنے لگا۔ تاہم وہ پارو کی کھوج مسلسل کرتا رہا۔ اپنے ایک دوست کی صلاح پر اس نے ٹیلیفون ڈائریکٹری سے خیراتی لال کا فون نمبر ڈھونڈ نکالا۔ اسی مہربان دوست کی محبوبہ کی مدد سے اس نے پارو سے ٹیلی فون پر بات کر لی۔ طے پایا کہ شام کو پارو اپنے مکان کے عقبی حصے میں اس کا انتظار کرے گی اور وہ پیچھے سے دیوار پھاند کر اندر آئے

گا۔

اس طرح رات کے اندھیرے میں بجلی کے کھمبے کا سہارا لے کر کلّو دیوار پر چڑھ گیا اور چھلانگ مار کر احاطے میں اُتر آیا جہاں پارو اس کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ ایک دوجے کو مدّت کے بعد دیکھنے کے باعث دونوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

''اتنے دن تم کہاں رہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب تم کبھی نہ آؤ گے۔''

''تمہارے ان مسٹنڈوں نے تو اندر آنے ہی نہ دیا۔ جب پوچھو تو کہتے تھے پاروتی میم صاحب شہر سے باہر چلی گئی ہیں۔''

''کلّو، انہوں نے مجھے بھی اس گھر میں قید کر رکھا ہے۔ میں انسان نہ ہوئی کوئی جانور ہوئی۔ تم مجھے اس نرک سے آزاد کرلو۔ ورنہ میں یہاں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔''

یہ الفاظ سن کر کلّو سکتے میں آ گیا۔ وہ اپنی ٹانگیں دیکھ کر مور کی مانند ناچنا ہی بھول گیا۔ اسے پارو کو آزاد کرنے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی۔

''پارو، میں نے اپنا گاؤں چھوڑ کر اسی شہر میں ایک لیدر فیکٹری میں مزدوری شروع کی ہے۔ اس آمدنی پر گزر بسر کیسے ہوگی۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ کہاں لے جاؤں تمہیں؟''

اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اونچی دیوار پھلانگنا اتنا مشکل کام نہیں ہے جتنا حقیقت کا سامنا کرنا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے مگر ہوش میں آ کر پھر پچھتانے سے کیا فائدہ۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ پارو کے قابل نہیں رہا اور اب اس کا وجود بھی پارو کے لیے عذاب بن چکا ہے۔

لیکن عشق پر بھلا کس کا زور چلتا ہے۔ وہ کئی بار دیوار پھلانگ کر پارو سے ملنے گیا اور ہر بار واپسی پر یہی ارادہ کر لیتا کہ پھر کبھی نہ آؤں گا۔

اس شام وہ قدرے جلدی آ گیا جھٹپٹے کا وقت تھا۔ گارڈ کی بدلی کا وقت۔ گارڈ کمانڈر احاطے کی سیکورٹی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے دور دیوار پر رینگتا ہوا سایہ نظر آیا۔ کمانڈر نے پاس ہی ایک پیڑ

کے پیچھے پوزیشن لی اور اپنا ریوالور نکال کر شست لی۔ دریں اثنا کلّو نے دیوار سے اترنے کے لیے چھلانگ لگائی۔ ایک زوردار تحکمانہ آواز نے اس کا استقبال کیا۔

''ہینڈس اپ۔''

کلّو کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ آگے پیچھے دائیں بائیں پارو کا کوئی نام ونشان ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس نے دونوں بازو اوپر اُٹھائے اور اپنے آپ کو کمانڈر کے حوالے کر دیا۔

پولیس تھانے میں زدوکوب ہوئی مگر اس نے اپنا منہ نہ کھولا۔ پارو کی لاج رکھنے کے لیے اس نے اپنا اصلی مقصد بیان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ تھانے میں اس کے نام کی فرد کٹ گئی۔ اسے ٹاڈا کے تحت دہشت گردی کے الزام میں قید کیا گیا۔ خیراتی لال کو جونہی اس بات کی خبر ملی اس نے پولیس کو انتباہ کیا کہ وہ سخت کارروائی کریں اور معاملے کو رازداری سے نپٹائیں تاکہ دہشت گرد مکافاتی کارروائی کر کے اس کی فیملی کو زک نہ پہنچائیں۔ کلّو اور پارو کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کہاں ملتا۔ پاروتی کو کانوں کان اس حادثے کی خبر نہ ہوئی۔

کلّو کے خلاف گواہیاں پیش کرنے میں کوئی زیادہ مشکلیں پیش نہیں آئیں کیونکہ اصل میں وہ دہشت گرد تھا ہی نہیں۔ اگر وہ کسی دہشت گرد یا سمگلنگ تنظیم سے وابستہ ہوتا تو بچنے کی تدبیریں پہلے ہی سے طے کی ہوتیں۔ نہ کوئی ثبوت رہنے دیا جاتا اور نہ کوئی گواہ۔ مگر بے چارے کلّو کو یہ سب کہاں معلوم تھا۔

''مسٹر کلیانی، کیا تم اپنا جرم قبول کرتے ہو؟'' کچہری میں جج کی آواز گونجی۔

''صاحب، میں دہشت گرد نہیں ہوں۔ میں بھگوان کی قسم کھاتا ہوں کہ مجھے دہشت گردی سے ذرا بھی واسطہ نہیں۔''

''اگر تم دہشت گرد نہیں ہو تو پھر تم کس غرض سے بنگلے میں گھس آئے تھے؟''

''صاحب میں آپ کو سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں جہاں منسٹر صاحب پہلے رہا کرتے تھے۔ نوکری ڈھونڈنے کے لیے میں نے کئی بار منسٹر صاحب سے ملنے کی کوشش کی مگر گیٹ پر کھڑے سپاہیوں نے مجھے اندر جانے سے روک لیا۔ میں نے بہت کہا کہ میں صاحب کے گاؤں سے تعلق رکھتا ہوں مگر وہ نہ مانے۔ میرے لیے دیوار پھاندنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ سو میں نے یہی راستہ اپنایا۔''

''منسٹر صاحب تو تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کر رہے ہیں۔''

''صاحب، اس میں میرا کیا دوش۔ جو سچ تھا وہ میں نے بیان کر لیا۔''

''ہم تمہاری باتوں پر کیسے یقین کر لیں۔ سارے ثبوت تمہارے خلاف جا رہے ہیں۔''

کلّو چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔

منصف نے اپنا فیصلہ سنایا۔ خدا کا شکر تھا کہ کلّو کے پاس سے کوئی ہتھیار یا گولی بارود برآمد نہیں ہوا۔ اس لیے صرف ایک سال قید کی سزا سنائی گئی۔

فیصلہ صادر ہونے کے فوراً بعد پولیس کلّو کو ہتھکڑیاں پہنا کر جیل لے گئی۔ گاؤں میں جب یہ خبر پھیل گئی تو سارے گاؤں میں واویلا مچ گیا۔ کلّو کا باپ بہت دیر تک بے ہوش پڑا رہا اور اس روز کے بعد مرض قلب میں دائمی طور پر مبتلا ہو گیا۔

سال گزرنے میں دیر نہیں لگی۔ کلّو رہائی کے بعد سیدھا گاؤں چلا آیا۔ جیل میں پارو کی یاد اسے پل پل ستاتی رہی۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہوا تھا۔ آب دیکھا نہ تاب، پھر پارو کے گھر کا رُخ کیا۔

وہاں بنگلے میں بڑی گہما گہمی تھی۔ سجاوٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ گارڈ بھی نئی وردیوں میں ملبوس مستعدی سے پہرا دے رہے تھے۔ کلّو کے قدم خود بہ خود رک گئے۔ اس نے باہر ہی سے سارے بنگلے کو نظر بھر دیکھ لیا۔ آنکھیں پارو کو تلاش رہی تھیں۔

اتنے میں دور سے بینڈ باجے کی آواز سنائی دی۔ سہرا باندھے، گھوڑے پر سوار ایک این آر آئی بزنس مین خراماں خراماں بنگلے کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ بنگلے کے اندر سے شہنائیوں کی سریلی آوازیں برات کا استقبال کررہی تھیں۔

پاروتو خیر زبردستی بیاہی گئی مگر گاؤں کے سیدھے سادے لوگ اس بے عزتی کو برداشت نہ کر سکے۔ سارے گاؤں پر وحشت سی طاری ہوگئی۔ ان کے آکروش کی کوئی سیمانہ رہی۔ وہ خیراتی لال کا نام ونشان مٹانے پر آمادہ ہوگئے۔ آدھی رات کو خیراتی لال کے آبائی مکان سے شعلے اٹھنے لگے۔

خیراتی لال کو یہ خبر اگلے روز ملی۔ وہ تلملا اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ اسی دم جا کر مکان کی خبر لے مگر ہمت نہ جٹا پایا۔

دوسرے روز سارے گاؤں میں چرچا ہوا کہ آگ کی لپٹوں میں رات بھر دو آتمائیں ناچتی دیکھی گئیں۔ یہ افواہ کس کے ذہن کی پیداوار تھی، کوئی نہیں جانتا مگر سچ تو یہ ہے کہ خیراتی لال کو اس کی آبائی زمین سے اُکھاڑ پھینکنے کا یہ ایک انوکھا طریقہ تھا۔

بھوت پریت اور چیخوں کی یہ کہانیاں دھیرے دھیرے شہر تک پہنچ گئیں۔ سبھی لوگ ان قصوں پر یقین کرنے لگے۔ اب تو بھوتوں کے اس بسیرے سے سارا گاؤں ڈرنے لگا تھا۔ دو چار سر پھرے رات کو اس جلے ہوئے کھنڈر کے سامنے چراغ جلا کر رکھ دیتے۔ خود خیراتی لال بھی یہ کہانیاں سن کر حیران ہو جاتا کہ وہ اور اس کا خاندان ایسے آسیب زدہ مکان میں کیسے رہ رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

وِرثے میں ملی سوغات

ہمارے شہر کے اسپتالوں کی حالت تو آپ کو معلوم ہی ہوگی۔ڈھونڈو تو ڈاکٹر لاپتہ، پوچھو تو نرسیں غائب اور مانگو تو دوائیاں ندارد۔مریض کو لانا، اس کا نام رجسٹر کروانا اور اس کو وارڈ میں لٹانا آپ کا فرض ہے۔باقی مریض گھر لوٹ سکے گا یا نہیں خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔

پورے شہر میں تین اسپتال ہیں جن میں سے ایک عورتوں کے لیے مختص ہے اور دوسرا بچوں کے لیے۔ہاں دو اسپتال اور بھی ہیں مگر ان میں سے ایک خالص ٹی بی مریضوں کے لیے ہے اور دوسرا پاگلوں کے لیے مخصوص ہے۔چنانچہ یہ عام انسانوں کے لیے نہیں ہے اس لیے ان کو گنتی میں لینا سراسر غلطی ہوگی۔دس لاکھ کی آبادی کے لیے صرف تین اسپتال ہیں جن میں بمشکل چار سو بستر سما سکتے ہیں۔اس پر مصیبت یہ کہ شہر سے ملحق دیگر اضلاع بھی انھیں اسپتالوں پر نربھر ہیں۔اب تک آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ان اسپتالوں میں صرف ایک ہی ایسا اسپتال ہے جو عام مریضوں کے لیے مخصوص ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسے لوگ 'بڑے اسپتال' کے نام سے جانتے ہیں۔

بڑے اسپتال کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے اور اس کے ساتھ میڈیکل

کالج بھی منسلک ہے۔اس لیے یہاں دوسرے اسپتالوں کی نسبت زیادہ سہولیات میسر ہیں۔

اسی اسپتال میں کرپارام بحیثیت اسٹور کیپر کے کام کرتا ہے۔اس نے سولہ سال کی عمر میں ہی اسپتال میں نرسنگ کا کام سیکھا تھا۔دس بارہ سال کمپونڈری کر کے اب ترقی پائی اور اسٹور کیپر ہو گیا۔

اس کی کمپونڈری کا زمانہ ہی کچھ اور تھا۔ایم بی بی ایس، ایم ڈی اور ایف آر سی ایس ڈاکٹر نایاب تھے۔زیادہ تر ڈاکٹر آر ایم پی یا ایل ایم پی ہوا کرتے تھے۔کئی جگہوں پر تو کمپونڈر ہی اس خلا کو پُر

کرتے۔ گلے میں سٹیتھسکوپ لٹکایا، مریض کی نبض ٹٹولی، دوچار گولیاں اور ایک آدھ مکسچر کی بوتل ہاتھ میں تھمائی اور ڈاکٹر کہلائے۔ تعجب اس بات کا تھا کہ اکثر و بیشتر مریض صحت یاب ہو جاتے۔ جو نہ ہوتے وہ اسے بھگوان کی مرضی سمجھ کر دعاؤں یا گنڈے تعویزوں کی طرف رجوع کرتے۔ بھولے بھالے لوگوں کا کیا۔ جہاں شفا کی کرن نظر آئی وہیں جوق در جوق چلے گئے۔ ان دنوں بیماریاں بھی پیچیدہ نہ تھیں۔ بس یہی نزلہ، زکام، دست یا پیچش۔ حد ہوئی تو نمونیا، ملیریا یا ٹی بی۔ اب تو بیماریوں کے نام لینے سے ہی جسم لرز اٹھتا ہے۔ ذیابیطس، کینسر، ہیپاٹائٹس، ایڈس......نہ جانے کہاں سے یہ بلائیں اتر آئیں۔

آج کل چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سے گزرنا ہو تو ڈاکٹروں کی مشورہ گاہیں، نرسنگ ہومز، اور تجربہ گاہیں ہر قدم پر آپ کا سواگت کریں گی۔ ان کی ڈگریاں پڑھ کر تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اس پر غضب یہ کہ ڈاکٹر نے ابھی نبض پر اپنا ہاتھ رکھا نہیں کہ ٹیسٹوں کی لسٹ مرتب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ پیشاب ٹیسٹ، خون ٹیسٹ، گلوکوز ٹیسٹ، ای سی جی، سونوگرافی، سی ٹی اسکین.......مریض تو لسٹ دیکھ کر ہی گھبراتے ہیں۔

کرپارام کے دست شفا کا چرچا دور دور تک پھیلا تھا۔ ہاتھ کلائی پر رکھتے ہی وہ مرض کی صحیح تشخیص کر لیتا۔ الماری سے دو چار دوائیاں نکال کر انھیں کھرل کرتا اور دس بارہ پڑیاں بنا کر مریض کے حوالے کرتا۔

''بوتل لائے ہو؟'' وہ مریض سے سوال کرتا۔

مریض اپنے بوسیدہ کمبل کے اندر سے بوتل برآمد کر کے سامنے رکھ دیتا۔ کرپارام ایک بڑے جار سے پہلے ہی تیار شدہ مکسچر اس بوتل میں انڈیل دیتا۔

''دو پڑیاں ابھی اسی وقت اور پھر دو پڑیاں چار چار گھنٹے کے بعد کھا لینا اور یہ رہا مکسچر۔ اسے صبح و شام دو ٹائم پی لینا۔ اگر بخار زیادہ ہو تو اس وقت یہ گولی لے لینا۔ ٹھیک ہونے میں کم سے کم ایک ہفتہ

لگ جائے گا۔" ہدایات اتنی عام فہم ہوتیں کہ سننے والے کو اور کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ البتہ خود کرپارام کو اپنے ہی دل میں یہ اندیشہ رہتا کہ نہ جانے مریض اس کی ہدایات پر پوری طرح سے عمل کرے گا یا نہیں۔ اس لیے وہ ہدایات کو بار بار دہراتا۔

اس کے ٹیکا لگانے کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ ٹیکا لگاتے وقت وہ مریض کو میٹھی میٹھی باتوں میں ایسے الجھائے رکھتا کہ مریض کو سوئی چبھنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔

کرپارام کی الماری ہمیشہ دوائیوں سے بھری رہتی۔ گولیاں، ٹیکے، مرہم اور بینڈ یج۔ ایسی کوئی اہم دوائی نہ تھی جو کرپارام کی الماری میں موجود نہ ہوتی۔ یہ دوائیاں وہ بازار سے خرید کر نہیں لاتا بلکہ اپنے ہی اسپتال سے خرد برد کر کے جمع کر لیتا۔ خیر یہ تو سرکاری اسپتالوں کا رواج ہی ہے۔ ڈاکٹر، نرسیں، کمپونڈر اور اسٹور کیپر سبھی ان دھاندلیوں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ لاچار غریب مریضوں کو خالی نسخے پکڑائے جاتے ہیں۔

یہی حال خون بنک کا بھی ہے۔ ہزاروں عطیہ دینے والوں کی قطاروں کے باوجود کبھی کسی تڑپتی غریب حاملہ کو بنک سے خون نہیں ملتا۔ نہ جانے اس وقت خون بھاپ بن کر اڑتا ہے یا پھر زمین میں بہہ کر جذب ہوتا ہے۔

بہر حال جو بھی ہو۔ یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ کرپارام بڑا رحمدل آدمی ہے اور یہ دوائیاں غریب لوگوں ہی کے کام آتی ہیں۔ دوائیوں کے عوض وہ زیادہ کچھ نہیں مانگتا۔ سبزی فروشوں سے تھوڑی سی سبزی، نانبائی سے دو چار روٹیاں، گوالے سے راتب ایک آدھ سیر دودھ یا پھر قصائی سے ہفتے عشرے میں کلو بھر گوشت۔ جن لوگوں کے پاس مبادلے کے لیے کچھ نہ ہوتا ان سے تھوڑی بہت نقدی وصول کر لیتا۔ حقیقت میں مریضوں کے لیے یہ سودا ڈاکٹروں کی نسبت بہت سستا پڑ جاتا۔ وہاں تو ایک طرف فیس دو، دوسری طرف دوائیوں کی قیمت ادا کرو اور پھر نہ جانے کتنی لیبارٹریوں کی خاک چھانتے پھرو۔ ضعیف الاعتقاد مریض کرپارام کو مسیحا سے کچھ کم نہ سمجھتے۔ اگر مریض نصف رات

کو بھی کرپارام کے دروازے پر دستک دیتے وہ کبھی بھی انہیں مایوس نہیں لوٹاتا۔

کرپارام کا بیٹا نٹور جب دس سال کا ہو گیا تو کرپارام نے گھر کے لیے سودا سلف لانے کا کام اسے ہی سونپ دیا۔

''نٹور، ذرا جا کر مادھو سے سبزی لے آنا۔ کمو کے بارے میں پوچھ لینا اور ہاں یہ دوائیاں بھی دے آنا۔'' کرپارام گھریلو زندگی میں بھی واضح طور پر ہدایات دینے کا عادی ہو چکا تھا۔

نٹور بڑے ہی چاؤ سے ہاتھ میں دوائیاں لے کر چل دیتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ بھی ان باتوں میں ماہر ہو گیا۔ اب اسے اپنے پتا جی سے دوائیوں کی خوراک پوچھنے کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ آخر مچھلی کے جائے کو تیرنا کون سکھائے۔

''مادھو بھیا، اب کمو کی طبیعت کیسی ہے؟ پتا جی نے یہ دوائیاں بھیجی ہیں۔ یہ کیپسول صبح و شام دو مرتبہ کھانے کے بعد اور یہ چھوٹی سی گولی رات کو سونے کے ٹائم پر دے دینا۔''

بدلے میں مادھو گانٹھ گوبھی، کمل ککڑی، اور گاجر نٹور کے جھولے میں ڈال دیتا۔ نٹور پھر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ وہ مادھو کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔

''اوہ میں تو بھول ہی گیا...... یہ لو تمھاری ٹافی..... اب خوش...!'' مادھو مسکراتے ہوئے کہتا۔ وہ سبزی کے علاوہ ٹافی، چاکلیٹ اور سگریٹ بھی بیچتا تھا۔ ان دونوں کے بیچ ایک بے تحریر معاہدہ ہو چکا تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ نٹور ٹافیوں سے اکتانے لگا۔ کئی دنوں سے اس کی نگاہیں سگریٹوں کے ڈبوں پر بار بار لوٹ آتیں۔ سگریٹ حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک ایسی چال چلی کہ مادھو دنگ رہ گیا۔

''مادھو بھیا۔ آج میں تمہارے لیے ایسی دوائی لایا ہوں کہ طبیعت مچل اٹھے گی۔''

''سچ....!'' مادھو انتظاریہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ پا رہا تھا کہ نٹور کیا چیز

لے کر آیا ہوگا۔

نٹور کے چہرے پر شریر مسکراہٹ پھیل گئی۔اس نے وضاحت کی۔

''بھیا،تم کہتے تھے نا کہ تمہاری کمر میں ہمیشہ درد رہتا ہے۔ٹھیک....!اس دوائی کے کھانے سے کمر کا درد چھو....! جوانی کے دن لوٹ آئیں گے۔بہت طاقت ور دوائی ہے۔''

مادھو کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔اسے تعجب ہوا کہ اتنی چھوٹی عمر میں نٹور ایسی باتیں کہاں سے سیکھ چکا تھا۔اس نے دوائی اپنی واسکٹ کے اندرونی جیب میں ٹھونس دی۔اتنے میں نٹور نے کیونڈر سگریٹ کا پیکٹ اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور اس کے ساتھ کھیلنے لگا۔مادھو اشارہ سمجھ گیا۔اس نے کھُلی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ نکال کر نٹور کو پیش کیا۔

''کیوں پینے کا من کرتا ہے؟ یہ لو۔اچھا سگریٹ ہے۔ادھر رسی سے سلگاؤ۔''

اس دن کے بعد ٹافیوں کی جگہ سگریٹوں نے لے لی۔اور وہ عادت اسے بہت دور تک لے گئی۔اب تو وہ دوکانداروں کی غفلت کا بھی فائدہ اٹھانے لگا۔سامنے رکھی ہوئی چیزوں پر بھی اپنا ہاتھ صاف کرنے لگا۔کبھی کبھار جو احساس گناہ ستاتا تو اپنے آپ کو یوں تسلی دیتا۔

''اس میں چوری ہی کیا ہے۔پاپا بھی تو ایسے ہی دوائیاں اسپتال سے چرا کر لاتے ہیں۔''

نٹور نے جب کالج میں داخلہ لیا تو اس کی دوستی گیان چند سے ہوئی۔گیان چند ایک اچھا اسٹیج آرٹسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ آل انڈیا ریڈیو کی یووانی سروس اور دوردرشن کے پروگراموں میں بھی شرکت کرتا تھا۔علاوہ ازیں وہ نٹور کا ہمسایہ بھی تھا۔اس لیے دونوں دوست ایک دوسرے کے گھر بھی آنے جانے لگے۔

چھ سات مہینے ایسے ہی گزر گئے۔ایک روز نٹور گیان چند کے گھر آ دھمکا اور اسے مدد کی درخواست کی۔''دوست، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔انکار تو نہیں کرو گے۔''نٹور نے التجا کی۔

''تم پریشان سے لگ رہے ہو۔کہو نا کیا بات ہے۔میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' گیان چند

نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا۔

''بھائی مجھے یووانی سروس میں فرمائشی پروگرام پیش کرنے کا آفر ملا ہے۔اس بارے میں مجھے کوئی جانکاری نہیں ہے۔آپ ذرا اسکرپٹ لکھوادو۔'' نٹور پُر امید نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''نٹور، یار تم اس جھنجھٹ میں کاہے کو پھنس گئے۔'' گیان چند نے استفسار کیا۔

''ہوا یوں کہ کچھ دن پہلے میں بشمبر کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن گیا تھا۔وہاں آپ کا ذکر چلا۔ پروڈیوسر صاحب سمجھے کہ میں آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔اس لیے اس نے مجھے یہ کام سونپ دیا۔میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ اس معاملے میں مجھے کوئی علم نہیں مگر وہ مانا ہی نہیں۔کہنے لگا تمھیں علم اور تجربے کی کیا ضرورت ہے۔تمھارا بھائی اتنا بڑا کلاکار ہے، وہ سکھادے گا۔جواباً میں کچھ بھی نہ کہہ پایا۔اور پھر یہاں چلا آیا۔''

''ارے بھئی، میرا فیلڈ بالکل الگ ہے۔تم نے کبھی مجھے فرمائشی گانے یا گیتوں بھری کہانیاں پیش کرتے ہوئے سنا ہے؟ یہ سب میرے بس کا روگ نہیں ہے۔'' گیان چند نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''جیسے بھی ہو۔مجھے تو اسکرپٹ لکھوانا ہی پڑے گا۔میں نے تو آپ کے بل بوتے پر ہی ہاں کردی۔ آپ کچھ بھی لکھوادو۔سب چلے گا۔'' نٹور نے فلمی گانوں کی فہرست سامنے رکھ دی۔

دوسرے روز نٹور اسکرپٹ لے کر ریڈیو اسٹیشن چلا گیا۔اپنا پروگرام ریکارڈ کروایا۔دھیرے دھیرے وہ پروگراموں کے لیے خود ہی اسکرپٹ تیار کرنے لگا۔گیان چند کی الماری میں پڑے میگزینوں سے استفادہ کرتا رہا۔ان میں سے موزوں فقرے، رومانوی اشعار اور کبھی کبھی پورے کے پورے بیانیہ پیراگراف نقل کر لیتا۔انھیں جوڑ توڑ کر اپنا اسکرپٹ تیار کر لیتا۔پھر اس کی گیتوں بھری کہانیاں بھی نشر ہونے لگیں۔اس کی آواز میں نکھار اور تحریر میں پختگی آنے لگی۔آواز کی کشش کے باعث اس کے پروگرام کافی مقبول ہونے لگے۔

نٹور کی مقبولیت کی خوشی سب سے زیادہ گیان چند کو ہوئی۔نٹور کو مبارکباد دینے کے لیے گیان چند نے اس کے گھر کا رخ کیا۔دروازے کی گھنٹی بجائی۔نٹور کی ماں نے دروازہ کھولا۔

''ماں جی،نٹور ہے کیا؟''

''نہیں بیٹے،وہ بازار گیا ہے۔بیٹھوابھی آتا ہی ہوگا۔''

گیان چند کمرے میں نٹور کا انتظار کرتا رہا۔تھوڑی دیر میں نٹور کی ماں چائے لے کر آگئی۔ کونے میں ایک پرانا اردو کا اخبار پڑا ہوا تھا۔اس نے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گیان چند سے کہا۔

'' بیٹے وہ اخبار بچھادو۔اسی پر چائے کی پیالی رکھ دوں گی۔بہت گرم ہے۔''

گیان چند نے اخبار فرش پر بچھادیا اور نٹور کی ماں نے اس پر چائے کی پیالی اور ناشتہ رکھ دیا۔ اخبار کو دیکھتے ہی گیان چند تذبذب میں پڑ گیا مگر اس نے اپنا ردعمل ظاہر نہ کیا۔

''یہ ہفتہ وار یہاں کیسے؟'' وہ سوچنے لگا۔دراصل وہ اخبار خاص حلقے کے لیے شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ اس کا مدیر گیان چند کا لنگوٹیا یار تھا اس لیے ایک عدد اعزازی کاپی اس کو بھی بھیج دیتا تھا۔جلدی سے چائے پی کر اور نظریں بچاتے ہوئے گیان چند نے اخبار کو الٹا پلٹا اور پایا کہ اس پر لکھا ہوا ایڈریس مٹایا جا چکا ہے۔پوسٹ آفس سے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ نٹور نے ڈاک خانے کے ڈیلوری اسٹاف کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ گیان چند اس کے بھائی سمان ہے۔اس لیے وہ گیان چند کے نام کی چٹھیاں اور میگزین نٹور کو دے جاتے۔نٹور کو جو چیز اپنے کام کی لگتی وہ اسے رکھ لیتا اور باقی ماندہ چیزیں گیان چند کے گھر میں دیر سویر پہنچا دیتا۔گیان چند کو اس بندوبست کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

گھر پہنچ کر گیان چند نے مزید تفتیش کی۔وہاں اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ نٹور نے بڑی صفائی کے ساتھ اس کی الماریوں سے کئی نادر کتابیں اور معلوماتی رسالے اڑا لیے تھے۔اس کے دل کو دھچکا

سالگا کیونکہ اس کو اس دغا بازی کی قطعی امید نہ تھی۔

رات بھر وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح مبہوت چھت کے پھٹے گنتا رہا۔اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔علی الصباح وہ اپنے بستر سے اٹھا، ہاتھ میں کاغذ قلم اٹھایا اور ایک مختصر سا خط تحریر کرنے لگا۔

میرے دوست نٹور! خوش رہو!

مجھے اس بات کی خوشی ہے کی تمہارے اندر پڑھنے لکھنے کا شوق اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب تم دوسروں کی کتابیں چرا کر پڑھنے لگے ہو۔علم حاصل کرنا زندگی کا اعلیٰ ترین منصب ہے۔مورکھ انسان تو دھرتی پر کیڑے مکوڑوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔گندی نالیوں میں جنم لیتے ہیں اور مر کر غلیظ نالوں میں بہہ جاتے ہیں۔

لیکن میرے دوست، مجھے حیرت اس بات کی ہے کہ تم علم حاصل کرنے کے اصولوں سے بالکل ناواقف ہو۔کتابی کیڑا بننا ایک بات ہوتی ہے۔علم حاصل کر کے اس پر عمل کرنا دوسری بات ہوتی ہے۔

جہاں تک میری یادداشت میرا ساتھ دے رہی ہے میری نظر سے آج تک ایسی کوئی کتاب نہیں گزری جس میں یہ درس دیا گیا ہو کہ دوسروں کی کتابیں چُرا کر علم حاصل کرنا چاہیے۔

میرے دوست! اپنی الماری میں کتابیں سجانے سے آدمی عالم نہیں بنتا۔اگر عالم بنتا ہے تو ان کتابوں کا مطالعہ کرنے سے۔جو صدق دل سے کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اور ان پر عمل کرتا ہے وہ دیر سویر بری عادتوں سے چھٹکارا پا ہی لیتا ہے۔

تم نے میری الماری سے جتنی بھی کتابیں چُرا لی ہیں، میری خواہش ہے کہ تم ان سب کا مطالعہ

کرو، ان کو سمجھنے کی کوشش کرو اور پھر ان پر عمل کرو۔ بھگوان تم کو سدبدھی دے۔

تمہارا خیر اندیش

گیان چند

خط کا نتیجہ یہ نکلا کہ نٹور نے گیان چند کے گھر آنا چھوڑ دیا۔ یا یوں کہیے کہ اس کی ہمت نہ ہوئی۔ راستے میں کہیں گیان چند کو دیکھ بھی لیتا تو کنّی کاٹ کر دوسری جانب چل دیتا۔ اس کا ضمیر روشن ہوا یا نہیں کسی کو نہیں معلوم۔ البتہ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس دن کے بعد گیان چند کی الماری سے نہ کوئی میگزین چوری ہوا اور نہ ہی کوئی کتاب۔

☆☆☆☆☆

مُخبر

شہر میں افواہ پھیلی کہ مخبروں کو موت کے گھاٹ اتارا جارہا ہے۔ پچھلے پچاس سال کے دوران وادی میں ایک بھی قتل کی واردات سننے میں نہ آئی تھی مگر اب تو آئے دن پانچ دس آدمی گولیوں کی نذر ہورہے تھے۔ ہر شخص کے چہرے پر خوف وہراس سے مردنی چھائی ہوئی تھی۔ خود اپنے سائے پر بھروسہ کرنا مشکل ہورہا تھا۔ ہر کوئی اپنے آپ سے سوال کرتا۔

''کہیں مخبروں کی لسٹ میں میرا نام تو نہیں...؟ کسی پولیس والے سے میری جان پہچان تو نہیں ...؟ یا پھر مجھے کسی سپاہی سے باتیں کرتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں...؟''

اس کا اضطراب بڑھ جاتا۔

میری سیاسی وابستگی کا کسی کو علم تو نہیں...؟ دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتیں۔

''کسی سرغنہ سے میرا کوئی عناد تو نہیں...؟ اس کے لہو کا دباؤ منتہا کو پہنچ جاتا۔ وہ دوسرے روز آنکھ کھلتے ہی کسی مقامی اخبار کے دفتر میں حاضری دیتا اور اپنی صفائی میں اشتہار چھپواتا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ کسی سیاسی تنظیم سے تعلق رکھتا ہے نہ کسی خبر رسانی میں ملوث ہے۔

موت اتنی ڈراؤنی نہیں ہوتی جتنی کہ اس کی آہٹ۔

ہر ایک آدمی موت سے بچنے کی سبیلیں کررہا تھا۔ کوئی معافی نامہ شائع کرواتا، کوئی اپنی صفائی پیش کرتا اور کوئی وادی ہی کو خیرباد کہہ دیتا۔

البتہ نیل کنٹھ نے ایسا کچھ بھی نہ کیا۔ اس نے اپنی زندگی کے پینسٹھ سال آسودگی، دل جمعی اور قناعت سے گزارے تھے۔ اس مکدّر ماحول کی پرواہ کیے بغیر وہ جیے جارہا تھا۔ نیل کنٹھ کا پرانی وضع کا مہاراجی اینٹوں سے بنا ہوا مکان، جس کی دیواریں مٹی سے لپی پتی تھیں اور چھت پر شنگل لگی ہوئی

تھی، حبہ کدل میں جہلم دریا کے کنارے واقع تھا۔

سارے شہر میں حبہ کدل ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ زندگی چہک اٹھتی۔ اِدھر مندروں کی گھنٹیاں بجتیں اور اُدھر مسجدوں سے اذانیں گونجتیں۔ پُل کے دونوں طرف جابجا خوانچہ والوں کی قطاریں لگ جاتیں۔ چیختے چلاّتے سبزی فروش، قسموں پر قسمیں کھاتے مچھلی فروش اور مول تول کرتے خریدار۔ ایک جانب نانبائیوں کی چنگیریوں سے خوشبوئیں اٹھتیں اور دوسری جانب حلوائیوں کے کڑھاؤں سے دودھ کی مہک۔ کوئی گائتری منتر کا جاپ کرتا ہوا مچھلیاں تُلواتا اور کوئی آیات کا ورد کرتا ہوا کمل ککڑی کے گٹھے جانچتا۔ پھر دن بھر گھوڑوں کی ٹاپوں کی صداؤں سائیکلوں کی ٹرن ٹرن اور آٹو رکشاؤں کی گڑگڑاہٹ سے سارا ماحول سرگرم رہتا۔ یہ شوروغل آدھی رات تک تھمنے کا نام بھی نہ لیتا۔ اسکول اور کالج ٹائم پر اس جگہ کی رونق ہی کچھ اور ہوتی۔ سفید کرتے و شلوار میں ملبوس حوروں کے قافلے اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے چھبیلے نوجوان جو ہر دم چھیڑ چھاڑ کی تاک میں لگے رہتے۔ یہاں موقع ملا نہیں تو انھوں نے پھبتی اڑائی اور آگے چلتی ہوئی دوشیزہ کے چہرے پر پسینہ نمودار ہو جاتا۔

آج نیل کنٹھ نہ جانے کیوں گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس کی عمر رسیدہ بیوی اَرن دتی نے حقّے میں نل کا تازہ پانی بھر دیا تھا۔ نیل کنٹھ نے چلم میں تمباکو ڈالا اور پھر اپنی کانگڑی میں سے دو تین انگارے نکال کر اس پر رکھ دیے۔ اس کے منہ سے دھوئیں کے بادل چھوٹنے لگے۔ چند ساعتوں کے لیے اس کے خیالات کا ربط ٹوٹ گیا۔ وہ کھانسنے لگا اور جلدی ہی اپنے خیالوں کی دنیا میں لوٹ آیا۔

شادی کے دن اسے صرف پُل پار کرنے کی ضرورت پڑی تھی۔ اَرن دتی کا مکان دریا کے اس پار واقع تھا۔ کھڑکی سے وہ اپنی بیوی کا مکان صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ دونوں مکانوں کے بیچ میں جہلم دریا اپنی شان و شوکت کے ساتھ بہتا چلا جا رہا تھا۔

چھوٹے موٹے گھریلو کام نبٹا کر اَرن دتی بھی پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ دیکھتے دیکھتے ہماری شادی کو پینتالیس سال ہو گئے۔''
نیل کنٹھ اَرن دتی کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

''آپ کو تو دل لگی سوجھی ہے۔ بھلا آج شادی کی یاد کیسے آ گئی؟'' اَرن دتی کو تعجب ہوا۔

''بس یونہی.... معلوم ہے آج کونسی تاریخ ہے؟'' اس دن ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔

''اس عمر میں تاریخ واریخ کون دیکھتا ہے جی۔ مجھے تو اپنا آپ بھی گزرے سال کا کلینڈر سا لگتا ہے جو دیوار پر بھگوان کی تصویر کے سبب لٹکا رہتا ہے جبکہ اس کلینڈر کی کوئی وقعت ہی نہیں ہوتی مگر اس کو پھاڑ کر پھینکنے کی کسی میں ہمت نہیں ہوتی ہے۔ سب اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ وہ کب خود بخود پھٹ جائے۔ آپ کو نہیں لگتا کہ ہم بھی ایسے ہی کاغذی معبود بن کر رہ گئے ہیں۔''

''تم سچ کہہ رہی ہو، اَرنی۔ ہم بھی دیوار پر ٹنگے ہوئے ان بوسیدہ کلینڈروں کی مانند اپنے حشر کا انتظار کر رہے ہیں۔''

ناتواں اَرنی کو یاد آیا کہ اس نے ہیٹر پر کشمیری قہوہ چڑھا رکھا تھا۔ ''شاید اب تک اُبل گیا ہوگا۔'' وہ سوچنے لگی اور دیوار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر دو کھاسو (کانسی کے پیالے) اور چائے کی کیتلی اٹھا کر لے آئی۔ نیل کنٹھ نے حقّے کی نَے زمین پر رکھ دی اور اپنے پھرن (کشمیری لباس) کے بازو سے کھاسو پکڑ لیا۔ ارن دتی نے کھاسو میں گرم گرم چائے انڈیل دی۔

''اَرنی، یاد ہے جب شادی سے پہلے میں اپنی چھت پر چڑھ کر تمھیں گھنٹوں دیکھتا رہتا۔''

''آج آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں آپ۔'' خاوند کو ٹوک کر اَرن دتی خود بھی انہی بچپن کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔

عمر میں اَرن دتی اپنے شوہر سے صرف پانچ سال چھوٹی تھی مگر پچھلے دس سالوں سے گٹھیا مرض نے آ دبوچا تھا جس کے باعث اس کے ہاتھوں کی انگلیوں میں کجی اور سوجن آ چکی تھی۔ موسم سرما میں حالت بد سے بدتر ہو جاتی۔ اٹھنے بیٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی مگر مجبوری تھی۔ آخر گھر کا کام کون کرتا۔

''بہت دنوں سے میری داہنی آنکھ پھڑک رہی ہے۔ معلوم نہیں کونسی آفت آنے والی ہے۔''
اَرن دتی نے چٹائی سے گھاس کا ایک تنکا کاٹ کر اس پر تھوک مل دی اور پھر اپنی داہنی آنکھ پر اس بھروسے چپکا دیا کہ آنکھ کا پھڑکنا بند ہو جائے گا۔

''بھگوان کی جو مرضی۔ ہونی تو ہو کر ہی رہے گی۔'' نیل کنٹھ کے لہجے میں اداسی تھی۔

اَرن دتی نے اس سے پہلے کبھی بھی اپنے شوہر کو اتنا فکر مند نہیں پایا تھا۔ بہت استفسار کرنے کے باوجود اسے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔ بہت دنوں سے اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ نیل کنٹھ شام ہوتے ہی اپنے مکان کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیتا ہے اور بار بار ان کے بند ہونے کا اطمینان کرتا ہے۔ گاہے بگاہے وہ رات میں جاگ کر کھڑکی کے پردے کو احتیاط سے ذرا ہٹاتا اور باہر کے ماحول کی ٹوہ لیتا۔ وہاں فوجی لاریوں اور جیپوں کی نقل و حرکت یا پھر گشتی دستوں کے قدموں کی چاپ کے سوا اور کچھ بھی سنائی نہ دیتا۔

''آپ اتنا کیوں گھبرا رہے ہیں۔ بھگوان پر بھروسہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اَرن دتی اپنے شوہر کو ڈھارس بندھانے کی کوشش کرنے لگی۔

''میں گھبرا نہیں رہا ہوں۔ مگر اَرنی، تمھیں نہیں معلوم۔ حالات بہت خراب ہو چکے ہیں۔ ہر جگہ موت کا تانڈو ہو رہا ہے۔ بھگوان ہی جانتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔'' نیل کنٹھ سے آخر کار رہا نہ گیا۔ اس نے سچی بات اگل ہی دی۔

اَرن دتی کو بچپن کے وہ دن یاد آئے جب کشمیر کی وادی پر قبائلیوں نے حملہ کیا تھا۔ وہ ان دنوں صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ آئے دن خونریزی اور عصمت دری کی ہولناک وارداتیں رونما ہو رہی تھیں۔

سرینگر شہر میں خبر ملی کہ قبائیلوں نے بارہ مولہ میں ہزاروں نہتے معصوم لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ مقامی کانونٹ میں گھس کر نصرانی راہباؤں کو اپنی ہوس کا شکار بنایا اور اب وہ سرینگر کی جانب چلے

آ رہے ہیں۔

شہر کی عورتوں، خاص کر لڑکیوں، نے ارادہ کرلیا کہ عصمت کھونے سے بہتر ہے کہ ننگی برقی تاروں سے لٹک کر جان دے دیں مگر شومئی تقدیر کہ عین موقعہ پر سارے شہر میں بجلی کی سپلائی بند ہوگئی۔ منصوبہ دھرے کا دھرارہ گیا۔ لحہ لحہ موت گراں ہوتی گئی۔

پھر ایک روز خبر ملی کہ ہندوستانی فوج نے قبائلی حملہ آوروں کو کھدیڑ دیا اور وہ دُم دبا کر بھاگ گئے ۔ سبھی نے راحت کا سانس لیا۔ اُرن دتی نے ان دنوں کافی سمجھ بوجھ اور ہمت سے کام لیا جس پر وہ آج بھی فخر کرتی تھی۔ وہ بات بات پر اپنی دلیری کا دم بھرتی اور اب جبکہ پھر ویسا ہی وقت آن پڑا وہ اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ''گھبرانے سے کوئی فائدہ نہیں جی۔ ہم نے تو قبائلی ریڈ دیکھا ہے۔ اس کے مقابلے میں تو یہ وارداتیں کچھ بھی نہیں۔ جیسے تیسے جھیل لیں گے یہ بھی۔ آپ دل چھوٹا نہ کرو۔''

نیل کنٹھ نے اپنی بیوی کا حوصلہ مند جواب سن کر اطمینان کی سانس لی لیکن دوسرے ہی پل اسے اپنی بیوی کی سادہ لوحی اور معصومیت پر ترس آیا۔ وہ روزانہ صبح سویرے اٹھ کر اخباروں کی ایک ایک لائن چاٹ لیتا تھا۔ اخبار ہی ایک ایسی شئے تھی جو اس کو باہر کے عالم سے روشناس کراتی۔ خبریں روز بروز ڈراونی لگ رہی تھیں۔ دونوں روحیں قفس میں پَر کٹے پرندوں کی مانند چھٹپٹاتی رہیں۔

''یہ سب آپ ہی کا کیا کرایا ہے۔ ویرو نے کئی بار امریکہ بلایا۔ آپ ہی نے منع کردیا۔ بھگوان جانے ایسا کونسا سریش لگا ہے جو آپ کو اس جگہ سے چپکائے رکھتا ہے۔ مانا اس کی بیوی امریکن ہے پھر کیا ہوا۔ ہمیں اسے کیا لینا دینا۔ آخر گھر سے نکال تو نہ دیتی۔ کسی کونے میں ہم بھی پڑے رہتے۔''

اُرن دتی نے اپنے دل کی بھڑاس آج نکال ہی دی۔

''سوال ویرو کی بیوی کا نہیں تھا۔ تم نہیں سمجھوگی۔ اس عمر میں اتنی دور جا کر رہنے سے دل گھبراتا ہے۔ ساری عمر ننھیال سے آگے کبھی قدم نہ رکھا۔ اب اس بڑھاپے میں سمندر کے اس پار کہاں جائیں۔ کیا معلوم کیسا ملک ہوگا؟ کیسے لوگ ہوں گے؟ وہاں کا رہن سہن کیسا ہوگا؟ اور پھر تم

سارا دوش مجھ پر ہی کیوں لادرہی ہو۔تمھاری بھی تو جانے کی مرضی نہیں تھی۔''

''اچھا جی ویرو کی بات چھوڑو، کاکی نے بھی تو بمبئی بلایا تھا۔آپ نے تو اس کو بھی انکار کر دیا۔کہا بیٹی کے گھر کا کھانا گئو مانس کے برابر ہوتا ہے۔بھول گئے کیا؟''

''اَرنی تم نہیں سمجھوگی۔اگر انھیں سچ مچ ہم سے محبت ہوتی تو آ کر ہمیں لے جاتے۔ہم منع تھوڑے ہی کرتے۔''

''وہ بے چارے تو دونوں آنے کو تیار تھے مگر آپ سے ڈرتے ہیں۔آپ کی بات تو پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔آپ نے تو اپنے خطوط میں صاف صاف منع کیا تھا۔''

ویرو اور کاکی دونوں اپنے اپنے کنبوں کی دیکھ ریکھ میں جُٹ گئے تھے اور یہاں بڈھا اور بڑھیا کلینڈر کی تاریخیں گنتے ہوئے وقت کاٹ رہے تھے۔

''آج شراون کرشن پکش کی ساتویں تاریخ ہے۔ویرو کے بیٹے کا جنم دن ہے۔اٹھ کر تہری بنالو۔'' نیل کنٹھ اپنی بیوی کو حکم دیتا۔

''آج جنم اشٹمی ہے۔کاکی کی بیٹی آج کے دن ہی جنمی تھی۔اسے تار بھیج دیا یا نہیں؟'' اَرن دتی یاد دلاتی۔دونوں میاں بیوی کو ویرو، کاکی اور ان کے بال بچوں کی بہت یاد آتی تھی۔بہت دنوں سے کوئی خط بھی نہیں ملا تھا۔بڑھاپا اور اس پر یہ علیٰحدگی کتنی جان لیوا ہوتی ہے۔آنکھیں ترس جاتی ہیں بچوں کو دیکھنے کے لیے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب خود غرضی ہے۔

''کل صبح بیٹے کو خط ڈالنا۔کہہ دینا ہم کو ٹکٹ بھیج دو۔ہم آنے کے لیے تیار ہیں۔'' اَرن دتی نے تحکمانہ انداز میں کہہ دیا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔کاکی سے بھی ٹیلیفون پر بات کر کے دیکھ لوں گا۔کچھ دن بمبئی میں رہیں گے اور پھر وہیں سے ویرو کے پاس چلے جائیں گے۔''

''جیسے مناسب سمجھو۔اب بہت رات ہوگئی، سو جاؤ۔'' اَرن دتی نے نائٹ لمپ روشن کر کے

ٹیوب لائٹ گل کر دی۔ لیکن نیل کنٹھ کی بے چینی برقرار تھی۔ وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ سبھی دروازوں اور کھڑکیوں کا معائنہ کیا۔ جب تک اسے اطمینان نہ ہوا کہ کہیں کوئی خطرہ نہیں ہے تب تک وہ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے اپنے سلگتی کانگڑی اَرن دتی کو تھما دی اور خود اپنے بستر میں گھُس گیا۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھا۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اتنے میں باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں روحیں کانپ اٹھیں۔ سمٹے سمٹائے وہ اپنے بستروں میں دبک گئے۔ انہوں نے اپنے سانسوں کے اتار چڑھاؤ کو بھی روک لیا۔

اُدھر تڑاخ سے دروازہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ پھر کمرے کے دروازے پر کسی نے لات ماری۔ وہ دروازہ زخم کی مانند کھل گیا۔ دو نوجواں منہ پر کالے مفلر باندھے ہاتھوں میں اسٹین گن لیے کمرے میں داخل ہو گئے۔

انھوں نے آ گا دیکھا نہ پیچھا۔ اندھا دھند کئی فائر کیے مگر اس سے پہلے ہی دونوں روحیں خوف و دہشت کے باعث جسم خاکی سے پرواز کر چکی تھیں۔ البتہ بہتے ہوئے خون سے دونوں بستر لہولہان ہو گئے۔

ہتھیار بند نوجوان مڑے اور اپنے پیچھے خاموشی چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ دوسرے روز یہ خبر جلی حروف میں نمایاں طور پر مقامی اخباروں میں شائع ہو گئی۔

’’ حبہ کدل میں مجاہدوں نے نیل کنٹھ اور اَرن دتی نامی دو مخبروں کو ہلاک کر دیا۔ ان پر شبہ تھا کہ وہ فوج کی سراغ رساں ایجنسی کے لیے سرگرم عمل تھے۔‘‘

☆☆☆☆☆

وِیُوگ

لفظ 'وِیُوگ' سے شاید آپ آشنا نہ ہوں۔ ہوں گے بھی کیسے! یہ خاص کشمیری زبان کا لفظ ہے جسے میں گھسیٹ کر اردو میں لے آیا ہوں۔اس کے بدلے میں لفظ 'رنگولی' بھی استعمال کر سکتا تھا مگر وہ بات نہیں بنتی۔کشمیری پنڈتوں میں شادی کے موقعے پر ایک رسم مقبول خاص و عام ہے اور وہ ہے مختلف رنگوں کے امتزاج سے بنی ہوئی دائرہ نما رنگولی پر دولہے کا استقبال کرنا۔طرح طرح کے ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔پھول پتّیاں نقش کی جاتی ہیں۔جلی حروف میں خوش آمدید نقش کیا جاتا ہے۔گھر میں داخل ہونے سے پہلے دولہے کی آرتی اسی رنگولی پر اتاری جاتی ہے۔پھر صدر دروازے پر دُوار پوجا ہوتی ہے۔اس کے بعد چار پانچ گھنٹے لگن منڈپ کی حرارت اور دھوئیں سے جوجھنا پڑتا ہے۔تب کہیں جا کر دولہن کا لمس نصیب ہوتا ہے۔

یوں تو شادی کی تیاریاں منہدی رات سے ہی شروع ہوتی ہیں۔اس روز بھی گھر کے دروازے پر مختلف رنگوں سے گُل بوٹے بنائے جاتے ہیں جس کو مقامی زبان میں 'کریول' کہا جاتا ہے۔ دروازے پر 'ویلکم'، 'سواگتم' اور 'لانگ لِو دی کپل' کے فقرے لکھے جاتے ہیں۔کریول اور ویوگ بنانے کا ہنر میں نے بچپن ہی میں سیکھا تھا۔ڈرائنگ اسٹوڈنٹ ہونے کی وجہ سے مجھے اس کام میں مہارت حاصل تھی۔سچ تو یہ ہے کہ جب تک میں رنگولی نہ سجاتا محلے کی لڑکیوں کی رخصتی نہ ہوتی۔

پرانے زمانے میں ویوگ کے لیے چونا اور پاؤڈر رنگوں کا استعمال کیا جاتا تھا لیکن بعد میں لکڑی کے برادے کو مختلف رنگوں سے رنگ کر اسے استعمال کیا جانے لگا۔اس ترکیب سے مخملی غالیچے کا تاثر پیدا ہونے لگا۔اس ضمن میں مجھے ایک پرانا قصہ یاد آیا۔میرے ایک دوست کی بہن کی شادی تھی۔ استقبال کا کام میرے ذمہ تھا۔ان دنوں سجاوٹ کا سامان کرائے پر نہیں ملتا تھا۔سب کچھ خود ہی کرنا

پڑتا تھا۔گلی کوچوں میں زنانہ شالوں اور ساڑیوں سے استقبالیہ ڈیوڑھیاں بنائی جاتی تھیں اور دو ڈیوڑھیوں کے درمیان حریری کاغذ کی جھنڈیاں لٹکائی جاتی تھیں۔اس روز اچانک میرے دماغ میں خیال آیا کہ کیوں نہ پوری گلی میں مختلف رنگوں کے برادے سے ڈیزائین دار قالین بچھایا جائے اور دونوں سروں پر 'خوش آمدید' اور 'لانگ لو دی کپل' نقش کیا جائے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر خود ہی اپنے کیے پر تعجب ہوا۔ مجھے یقین ہی نہ آیا کہ یہ کام میرے ہاتھوں سے سرانجام ہوا ہے۔اتفاقاً دولہے کا باپ کسی اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر تھا اور اچھے آرٹ کا مداح۔ برات جونہی گلی کی جانب مڑی اس کی نگاہ اس رنگے ہوئے برادے کے قالین پر پڑی۔اس نے براتیوں کو روک کر ہدایت دی کہ وہ لائن بنا کر احتیاط سے ایک سائیڈ سے چلیں تاکہ قالین خراب نہ ہو۔ مجھے یہ سن کر بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔

ہمارا آبائی مکان شہر کے گنجان علاقے میں واقع تھا۔ پاس پڑوس میں کیا ہوتا ہے سب کی خبر رہتی تھی۔ایک روز اچانک سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند نمودار ہوا۔اس سے پہلے بھی اس کھڑکی پر لوگ آتے جاتے رہے لیکن کسی نے میرا دھیان اپنی طرف نہیں کھینچا۔اس دن نہ جانے میرے دل میں کیسی ٹیس سی اٹھی اور میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

ایسا نہیں تھا کہ ہم پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔بچپن میں ہم سب محلے کے لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے مگر جو کیفیت اس وقت ہوئی ویسی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی،اس لمحے سے قبل مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ چندر ما ایک لڑکی ہے جو جوان بھی ہے اور خوبصورت بھی۔اس سے بھی بڑھ کر وہ نفاست اور سادگی کا پیکر لگ رہی تھی۔ محلے میں بہت ساری لڑکیاں اور بھی تھیں مگر اس کی تو بات ہی نرالی تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جس مثالی پیکر کی مجھے جستجو تھی وہ آج میرے سامنے کھڑا ہے۔ ہو بہو ویسا ہی ...گوشت پوست کا بنا ہوا... ہنستا ہوا،مسکراتا ہوا۔ پہلی بار میرے دل میں اس پیکر ناز کو اپنا بنانے کی خوا

ہش پیدا ہوئی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔

ایک دوسرے کو دیکھنے کا اشتیاق روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ میں دن بھر یونیورسٹی میں اس کے خیالوں میں کھویا رہتا اور واپس گھر لوٹنے کے لیے بے چین رہتا۔ وہ پاس ہی ایک پرائیویٹ اسکول میں کام کرتی تھی۔ اپنی حاضری کی خبر دینے کی غرض سے وہ اپنی چھوٹی بہن کو اس زور سے پکارتی کہ مجھے خود بخود اطلاع مل جاتی اور میں پلک جھپکتے ہی اپنی کھڑکی پر حاضر ہو جاتا۔

سامنے کھڑکی پر روبرو بیٹھنے میں اسے ڈر لگتا تھا۔ اسی کمرے کے نیچے ان کی رسوئی تھی جہاں سے وہ مجھے اور میں اس کو بڑی آسانی کے ساتھ دیکھ سکتے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ آہستہ آہستہ اس نے رسوئی میں اپنے قدم جمائے۔ دن بھر کی تھکاوٹ کو نظر انداز کر کے وہ خوشی خوشی رسوئی کا کام کرتی اور اسی میں سکون اور مسرت محسوس کرتی۔

ہماری کھڑکی کی دیوار اتنی چوڑی تھی کہ اس پر آرام سے بیٹھا جا سکتا تھا۔ اس پر بیٹھ کر کتابیں پڑھنا میرا روز کا معمول بن گیا۔ ہر دن اس کو دیکھنے سے میری تشفی ہو جاتی۔ راتیں سپنوں میں کٹ جاتیں اور دن تدبیروں میں۔ جس دن چندرما کا دیدار نہ ہوتا زندگی سونی سونی سی لگتی۔

گو محبت میں بزدلوں کا کوئی کام نہیں مگر ہم دونوں ہی بزدل تھے۔ ایک دوسرے کی آہٹ سنتے ہی کھڑکی کی جانب کھنچے چلے آتے۔ گھنٹوں ایک دوسرے کو نہارتے۔ اکثر وہ سامنے والی کھڑکی کی اوٹ میں بیٹھی رہتی لیکن بدنامی کے خوف سے بلاواسطہ سامنے آنے سے گریز کرتی۔ عجیب سا سنکوچ تھا۔

میں نے بارہا خاموشی کی اس دیوار کو توڑنے کی کوشش کی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ دیکھتے ہی بات چھیڑوں اور پھر باتوں باتوں میں کہیں ملنے کا اشارہ کر لوں۔ جب وہ سامنے آجاتی تو میرے اوسان خطا ہو جاتے۔ رٹے ہوئے سبھی ڈائیلاگ حلق میں مچھلی کے کانٹے کی طرح اٹک جاتے اور پھر گفتگو روایتی علیک سلیک سے آگے نہ بڑھتی۔

کئی بار سوچا کہ خط لکھ کر یہ کارِ خیر انجام دوں۔ ہر بار خوبصورت پیڈ پر خوشخط چٹھیاں تحریر کیں۔ الفاظ چن چن کر نگینوں کی طرح جڑ دیے۔ خطوط کو تہہ کر کے چندر ما کے آنے کا انتظار کیا۔ اسکول سے واپس آ کر وہ حسب معمول اپنی چھوٹی بہن کو آواز دیتی اور پل بھر کے لیے سامنے والی کھڑکی پر نمودار ہوتی۔ میں جیب سے خط نکالتا اور اس کی جانب پھینکنے کی کوشش کرتا۔ درمیان میں ایک گلی کا فاصلہ تھا۔ میرا بازو سیسے کی مانند بھاری ہو جاتا اور میرا ساتھ دینے میں ناکام رہتا۔ اس وقت میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے پیدا ہوتے۔ ''اگر خط کوئی اور اٹھا لے تو ہم دونوں کا کیا حشر ہوگا؟ وہ اس نازیبا حرکت کو ہرگز پسند نہیں کرے گی اور اس بات پر مجھے ساری عمر معاف نہیں کرے گی۔'' اسی تذبذب میں وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔

طیش میں آ کر میں خط کے پرزے کر ڈالتا اور ہوا میں اڑا دیتا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ ترسیل کا یہ طریقہ سب سے بھونڈا ہے کیونکہ چندر ما تک خط پہنچانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ دراصل چندر ما کو جس شدت سے میں چاہتا تھا اسی شدت سے میں اس کی تعظیم و تکریم بھی کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس بت کی پوجا کرنے لگا تھا۔

مجھے یاد ہے ایک روز میں یونیورسٹی سے لوٹ کر اپنی کھڑکی پر بیٹھا تھا۔ آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اندھیرا اتنا چھا گیا تھا کہ کہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چندر ما کے درشن کے امکانات صفر کے برابر تھے۔ آسمان پر اچانک جنگ کا سماں بندھ گیا۔ بادل گرجنے لگے۔ بجلیاں کوندنے لگیں۔ اتنے میں زوردار بجلی چمک اٹھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے بجلی ہماری گلی میں آ کر گری۔ اسی تیز روشنی میں سامنے کھڑکی پر چندر ما کا رُخِ تاباں مختصر لمحے کے لیے نظر آیا۔ اس مختصر جلوے سے مجھے اندازہ ہوا کہ جب خدا نے کوہِ طور پر حضرت موسیٰ کو اپنا دیدار دکھایا ہوگا تو ان پر کیا گزری ہوگی۔ وہ منظر میرے وجود کا حصہ بن چکا ہے۔ اگر میں تاثراتی آرٹسٹ ہوتا تو اس تاثر کو کینواس پر اتار کر لازوال بنا دیتا۔

وقت کے گزر جانے کا ہمیں پتہ ہی نہ چلا۔ چندر ما کی شادی طے ہوگئی۔ وہ بابل کی گلیوں کو چھوڑ کر جانے والی تھی۔ ان دنوں میں ہینڈی کرافٹس ایمپوریم میں منیجر بن گیا تھا۔ دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ بدنامی کا ڈر، عزت وناموس کا پاس اور والدین کی فکر۔ یہی اسباب تھے جنھوں نے ہمیں کمزور اور بزدل بنایا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وقت مقررہ کا انتظار کرلوں۔

حالات سے سمجھوتا کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس نے کھڑکی پر آنا اور اپنی بہن کو بلانا ترک کر دیا۔ گھر کے کام کاج میں اب اس کا من بالکل نہیں لگتا تھا۔ رسوئی میں بھی زیادہ تر اس کی ماں ہی نظر آنے لگی۔ لڑکی جب دل میں اپنے پتی پرمیشور کو بسا لیتی ہے تو کسی دوسرے شخص کا خیال کرنا بھی پاپ سمجھتی ہے۔ شاید اسی جذبے کے تحت چندر ما اب مجھ سے کنارہ کرنے لگی تھی یا پھر سوچتی ہوگی کہ اس بزدل سے امیدیں باندھنے سے کیا حاصل۔

میں تھا بھی بڑا نکما۔ کچھ کر بھی نہ پایا۔ بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ البتہ نیند میں اکثر خواب دیکھتا رہتا۔ اچھے بھی اور برے بھی۔ بعض اوقات میں اریبین نائٹ کی مانند رخش پر سوار اس کی گلی میں چلا جاتا۔ وہ اپنی کھڑکی سے کود کر میرے گھوڑے پر بیٹھ جاتی اور پھر ہم دونوں ہوا ہو جاتے یا پھر کبھی میں کسی نامعلوم جزیرے پر اس کو ڈھونڈتا رہتا۔ وہ اچانک سامنے سمندر میں ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی نظر آتی۔ مجھے مدد کے لیے پکارتی رہتی۔ کوشش کے باوجود میں اس کے پاس نہیں پہنچ پاتا اور وہ میری آنکھوں کے سامنے سمندر میں ڈوب جاتی۔ کبھی وہ آسمان پر پری بن کر اُڑ جاتی اور مجھے ساتھ آنے کے لیے ترغیب دیتی۔ میں اڑنے کی ہزار کوششیں کر کے بھی اُڑ نہیں پاتا۔ بچوں کی مانند زار و قطار روتا جب تک وہ کافور ہو جاتی۔

ان خوابوں نے مجھے خاصا پریشان کر رکھا تھا۔

آخر کار شادی کا دن نزدیک آیا۔ میرے من میں خیال پیدا ہوا کہ چندر ما کو کوئی ایسا یادگار تحفہ پیش کروں جو وہ عمر بھر یاد رکھے گی۔ دنیا کے سامنے اسے تحفہ دینا قیامت سے کم نہ تھا۔ یکا یک مجھے

خیال آیا کہ اس کی شادی میرے بغیر نامکمل ہے۔ ویوگ تو مجھے ہی بنانا پڑے گا۔ جب تک میں اس کی رنگولی نہیں سجاؤں گا تب تک اس کی بدائی ناممکن ہے۔ دل میں ہلچل سی مچ گئی۔ میں نے دل میں ٹھان لی کہ اس کی شادی پر میں اپنی زندگی کی بہترین رنگولی بناؤں گا اور اس کے بعد کبھی کوئی رنگولی نہیں بناؤں گا۔ دل چاہتا تھا کہ برادے کو اپنے خون دل سے رنگ لوں اور اپنے جذبات کو ایسی علامتوں سے پیش کروں جن سے وہ میرے دل کی کیفیت سمجھ جائے۔ کہاں تو میں اس شادی کے نام ہی سے بیزار تھا اور کہاں اب اس دن کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔

شادی کے تین روز پہلے چندر ما کے پتا جی میرے گھر آئے اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''آ کاش بیٹے، آج کل تم دکھائی ہی نہیں دیتے۔ کہاں رہتے ہو؟''

''انکل، یہیں تو رہتا ہوں۔ آج کل آفس میں زیادہ کام رہتا ہے اس لیے دیر سے گھر آتا ہوں۔''

''بیٹے، چندر ما کی شادی پر تمھیں ویوگ نہیں بنانا ہے کیا؟ سامان وامان تو لکھوا دیا ہوتا۔'' اس نے جیسے میرے دل کی بات کہہ دی۔

''ہاں انکل، میں تو بھول ہی گیا۔''

میں نے سامان کی لسٹ تیار کر کے ان کے حوالے کر دی اور وہ رخصت ہو گئے۔ اِدھر میں خوابوں میں کھویا رنگولی کے ستارے جوڑتا رہا۔ میں اس خیال سے ہی سرشار تھا کہ آج تک کسی نے اپنے محبوب کو ایسا انوکھا تحفہ نہیں دیا ہوگا۔

دوسرے روز مجھے آفس جانے میں دیر ہوئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کلرک نے خبر دی کہ مینجنگ ڈائریکٹر سے دو بار بلاوا آیا ہے۔ گھبراہٹ میں میں ان کے کمرے کی جانب دوڑا۔ میری توقعات کے برعکس ان کے چہرے پر کہیں کوئی خفگی نہیں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بول اٹھے۔

''آ کاش، یہ تمھارا فارم ہے۔ میں نے تمھیں ایکسپورٹ ایگزیکٹو ڈیولپمنٹ پروگرام کے لیے

نامزد کیا ہے۔ فارم پر میں نے دستخط کر دیے ہیں۔ پروگرام کل سے گلمرگ ہائی لینڈ ہوٹل میں شروع ہو رہا ہے۔ کورس ڈائریکٹر مسٹر مہتا مجھے جانتے ہیں۔ تم براہ راست ان سے ملنا اور میری طرف سے کہنا کہ کورس کی فیس ان کے دلّی آفس کو بھیج دی جائے گی۔ وقت بہت کم ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ آج شام کو ہی وہاں پہنچ جاؤ۔ تم ابھی واپس گھر جا کر تیاری کر لو۔''

ان کے منہ سے فقرے ایک کے بعد ایک اُبل رہے تھے اور میں دم بخود ہو کر ان کو گھور رہا تھا۔ انبساط کے بجائے میرے چہرے پر اضمحلال کی شکنیں نمودار ہوتی گئیں۔

''کل صبح...! ٹریننگ کورس...! آج رات حاضری...! پرسوں چندرما کی شادی...! رنگولی کی ذمہ داری ...! میں... میں کیسے جاسکوں گا؟'' میرے ذہن میں تلاطم سا مچ گیا مگر انکار کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

''نہ جانے کیا سوچ کر منیجنگ ڈائریکٹر نے مجھے اس کورس کے لیے نامزد کیا ہوگا جبکہ آرگنائزیشن میں اور بھی بہت سارے منیجر تھے۔ آخر انھوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا۔ اگر میں انکار کرنا بھی چاہوں تو کیا بہانہ بناؤں؟ کہہ دوں کہ دو دن کے بعد میری معشوقہ کا بیاہ ہونے والا ہے اور مجھے بدائی پر اس کے لیے رنگولی بنانی ہے۔ وہ میری حماقت پر ہنسیں گے، قہقہے لگائیں گے۔ میں ان کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتا۔'' اس طرح میں نے اپنی اندر کی آواز کو کچل ڈالا۔

اس وقت میں سچ مچ بہت بزدل ثابت ہوا تھا۔ منہ سے ایک شبد بھی نکال نہیں پایا۔ بجھا بجھا سا میں ان کے کمرے سے باہر نکلا اور سیدھے اپنے گھر پہنچ گیا۔ جلدی جلدی رختِ سفر باندھا۔ ہمت کر کے تھوڑی دیر کھڑکی پر کھڑا دیکھتا رہا۔

سامنے والے گھر میں شادیانے بج رہے تھے۔ کافی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ عورتیں روایتی انداز میں شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ ادھر آنگن میں بچے خوب شور مچا رہے تھے۔ چندرما کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پانچ دس منٹ یوں ہی انتظار کر کے میں نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور دل برداشتہ لے

کر بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔ گلی میں کئی بار مڑ کر کھڑکی کی جانب دیکھا لیکن وہ خالی تھی بالکل خالی۔

ٹریننگ کورس کے دوران میں صرف چندر ما کے بارے میں سوچتا رہا۔ طرح طرح کے خیالات دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔

''نہ جانے چندر ما کے پتا جی نے میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔ وعدہ خلافی کے لیے وہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔''

''ایک نادر موقعہ ملا تھا زندگی میں۔ مگر میں کتنا بز دل نکلا...!''

''آج چندر ما کی شادی ہو رہی ہوگی۔ معلوم نہیں رنگولی کس نے بنائی ہوگی....؟ کیسی رنگولی بنائی ہوگی۔''

''چندر ما کو میں اپنا تحفہ پیش نہیں کر پایا۔ میری مجبوریوں کا اسے کہاں علم ہوگا۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ چندر ما نے سوچا ہوگا کہ میں گھر سے عمداً غائب اس لیے ہوا کیونکہ میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر پاتا۔''

اس نے چاہے جو کچھ بھی میرے بارے میں سوچا ہوگا حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ اپنے وجود ہی سے نفرت ہونے لگی تھی اور اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ بز دلوں کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ بھگوان بھی ان لوگوں کا ساتھ نہیں دیتا۔

☆☆☆☆☆

وفادار کُتا

''سپروصاحب......!'' پلیٹ فارم کے شوروغل کو چیرتی ہوئی وہ آواز میرا تعاقب کرنے لگی۔ میں پیچھے مڑا۔محمد شفیع لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے قریب آیا اور لپک کر بغل گیر ہوا۔

''اوہو،شفیع بھائی۔تم یہاں کیسے.....؟ میں نے سوال کیا۔

ہم دونوں سات سال کے طویل وقفے کے بعد ملے تھے۔یادوں کے طوفان دونوں طرف اُمنڈ پڑے۔اچانک ملاقات اور وہ بھی دِلّی کے ریلوے اسٹیشن پر۔میرا بھانجا آشوتوش اور اس کی نوبیاہتا بیوی میرے ساتھ تھے۔

''پنکی جہلم ایکسپریس سے جموں جارہی ہے۔اسی کو گاڑی میں بٹھانے کے لیے آیا ہوں۔'' میں نے بہو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں ابوظہبی سے آرہا ہوں۔وہاں قالینوں کی دُکان کھول رکھی ہے۔'' محمد شفیع نے اپنی موجوگی کا جواز پیش کیا۔

محمد شفیع کا باپ ایک غریب نادار درزی تھا جو کپڑے سینے کے علاوہ جھاڑ پھونک اور گنڈے تعویذ کرنا بھی جانتا تھا۔جغرافیہ میں ایم اے پاس کر کے محمد شفیع نے سنٹرل مارکیٹ میں اپنی دوکان کھولی تھی۔شادی کیا ہوئی کہ کایا ہی پلٹ گئی۔سالے نے گورنمنٹ سپلائی کے کئی ٹھیکے دلوائے۔قالین سازی کے کارخانے لگانے کے لیے بنکوں سے قرضہ فراہم کروایا۔دیکھتے ہی دیکھتے محمد شفیع 'درزی' سے 'قریشی' ہوگیا اور نہ جانے کن کن پیر پیغمبروں کے ساتھ حسب نسب جوڑنے لگا۔

ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم دونوں کے چہرے فرطِ انبساط سے کنول کی مانند کھل اٹھے۔وہ مجھے دیدۂ حسرت سے تک رہا تھا۔اسے امید تھی کہ میں وادی کے حالات کے بارے میں دریافت کرلوں

گا مگر میں نے مصلحتاً کچھ پوچھنے سے گریز کیا۔ کیوں....؟ مجھے معلوم نہیں۔ شاید اس لیے کہ میرے پوچھنے یا نہ پوچھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

آخر کار اس سے رہا نہ گیا۔ ''بھئی، آپ نے تو ہمیں بھی غیر سمجھا۔ کوئی خیر خبر نہیں۔ کبھی تو خط و کتابت یا پھر ٹیلیفون سے رابطہ کر لیا ہوتا۔''

میں تب بھی چُپ رہا۔

''کم سے کم بتا کے تو جانا چاہیے تھا۔ ہم کون سے دشمن تھے آپ کے۔''

میرے ہونٹ جیسے گوند سے چپکے ہوئے تھے۔ پنکی بار بار مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ ''جواب کیوں نہیں دیتے۔ نکالو اپنے دل کی بھڑاس۔ ڈر کس بات کا۔ جو کہنا ہے کہہ دو۔''

میں بدستور چپ سادھے رہا۔

''سپرو صاحب......! آپ نے تو جاتے وقت کمال ہی کر دیا۔ اپنے کُتّے کو وہیں پر چھوڑ آئے۔ بے چارہ کئی دن بھوک سے تڑپتا رہا، بلکتا رہا۔ میری بچی کہہ رہی تھی کہ انکل کتنے ظالم ہیں ا۔ بے زبان جانور کو یونہی چھوڑ کر چلے گئے۔''

شفیع قریشی کی طبیعت میں آج بھی وہی شوخی تھی۔ وہی خوش کلامی۔ وہی ظریفانہ رنگ۔ وہی سرعت کے ساتھ باتیں کرنا۔ فرق اتنا تھا کہ قراقل ٹوپی کے دامن میں سفیدی ایسے پھیل چکی تھی مانو برفباری ہو چکی ہو۔

میری آنکھوں کے سامنے اپنے کُتّے کی تصویر اُبھر آئی۔ خالص ایلسیشن نسل کا کتا تھا۔ دیوہیکل، قد آور اور پھرتیلا۔ اس کو دیکھتے ہی لوگوں کے ہوش اُڑ جاتے تھے۔ کیا مجال کوئی اس کے نزدیک بھی پھٹکتا۔

''کیا نام تھا اس کا.....؟ مجھے تو اس کا نام زبان زد تھا۔ نہ جانے کیسے ذہن سے اتر گیا۔'' محمد شفیع

اپنے دماغ پر زور دینے لگا۔ کچھ وقفے کے بعد وہ پھر بول اٹھا۔ ''راکی... ہاں مجھے یاد آیا....راکی ....کتنا پیارا نام تھا اس کا۔ انگریزی میں راکی اس مُکّے باز کو کہتے ہیں جو بہت سارے مُکّے کھا کر بھی ڈٹا رہتا ہے۔''

''واہ کیا تاویل ڈھونڈلی آپ نے۔'' میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ تو اسے بے سہارا چھوڑ کر چلے گئے۔ سوچا بھی نہیں اس کا کیا حشر ہوگا۔'' محمد شفیع نے پھر اپنے الفاظ دہرائے۔ وہ بار بار راکی کا ذکر کرتا رہا اور یہ بھول ہی گیا کہ میرے خاندان میں اور بھی بہت سارے افراد تھے جو اس وقت زندگی اور موت کے بیچ جھول رہے تھے۔

میری آنکھوں کے سامنے ساری کالونی کی تصویر گھومنے لگی۔ محمد شفیع کا گھر، شیو جی امبار دار کا گھر، پھر اپنا گھر۔ شیو جی شالوں کا ہول سیل تاجر تھا۔ دوۡ دکانیں اور دو کنال زمین پر بنا ہوا تین منزلہ مکان، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ پہلے ہی بھاگ گیا۔ میں نے اس کو روکنے کی ہزار کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔

''بھائی صاحب، جان بچی لاکھوں پائے۔ سن سینتالیس میں میں بارہمولہ میں تھا۔ ان بدنصیب آنکھوں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ اب یہاں رہنا مناسب نہیں۔ شہر کے حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں۔''

اس کے باوجود میں نے ہمت نہ ہاری۔ ڈٹا رہا۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں کو دلاسہ دیتا رہا مگر اس دن میرا دل بھی دہل گیا۔ دو ہتھیار بند آدمی سامنے والے مکان میں گھسے اور اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ تین لاشیں میری آنکھوں کے سامنے زمین پر گر پڑیں۔ سارا صحن لہو سے رنگ گیا۔ میں اپنے مکان کی کھڑکی کے پیچھے جم کر برف ہوگیا۔ اس واقعے کے بعد میں نے اپنے گیٹ سے باہر قدم بھی نہ رکھا۔ پہلی بار مجھے اپنی بزدلی کا احساس ہوا۔ اپنی زندگی اور اپنے بال بچوں کی خاطر میں کوئی جوکھم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

جھٹپٹے کے وقت میں نے اپنا رخت سفر بندھوانا شروع کیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ اس رات مجھے کسی کو اپنی نقل مکانی کی خبر دینا خطرے سے خالی نہیں لگا۔ محمد شفیع کو بھی نہیں۔

کئی روز سے رونما ہوئے واقعات سے ہم گھبرا گئے تھے۔ میری بیوی اور بچے سہمے سہمے اکڑوں بیٹھے رہتے تھے۔ ہر طرف سے گولیوں کی گڑگڑاہٹ، بموں کے پھٹنے کی آوازیں اور فائر بریگیڈوں کی گھنٹیوں کا مسلسل شور ماحول کو دہشت زدہ بنا رہا تھا۔ موت کے سائے چاروں جانب منڈلاتے نظر آرہے تھے۔ مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ جب سامنے دیوار پر قضا پھڑ پھڑاتی ہو تو آدمی بھائی بندو، دوست دشمن، اپنے پرائے کسی پر بھی اعتبار نہیں کرتا۔

اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ جینے کی آرزو کیا ہوتی ہے۔ ایک پل جینے کے لیے آدمی کتنے ہی نذر و نیاز کرتا ہے۔ ہم بھی اسی پل کی آس لگائے اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر زندگی کی تلاش میں چل پڑے۔

ایک ماروتی تھی جس میں پچھلی سیٹوں پر تین افراد بیٹھ گئے۔ میری بیوی اور میرے والدین۔ سامنے میرے بغل میں میرے دونوں بچے بیٹھ گئے۔ پھر جس کو جو سامان ہاتھ لگا وہ گاڑی میں بھر دیا۔ کچھ سامان گود میں اٹھالیا۔ کہیں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ پھر راکی کو کہاں رکھتے۔

''پاپا.....راکی.....!'' جونہی میں نے گاڑی اسٹارٹ کی میری بیٹی اچھل پڑی۔

''نہیں بیٹے، اسے یہیں رہنے دو۔'' میں نے اپنے آنسو پیتے ہوئے اسے روکا۔

''نو پاپا، ہم اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں وہ بھی تو ہماری فیملی کا ایک ممبر ہے۔'' میرا بیٹا جرح کرنے لگا۔

''بیٹے یہ ممکن نہیں۔ اسے یہیں رہنا پڑے گا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر جواب دیا۔

''کیوں.....؟ آخر کیوں.....؟ ہم اس کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جا سکتے ہیں؟ کہیں نہ کہیں تو جگہ نکال ہی سکتے ہیں۔'' دونوں بچوں کو حالات کی شدت کا اندازہ نہ تھا۔

''بات اس کے لیے جگہ نکالنے کی نہیں ہے بیٹے۔ پرابلم یہ ہے کہ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ ہم کہاں

جا رہے ہیں۔وادی کے باہر ہمارا کوئی سگا سمبندھی بھی تو نہیں ہے۔ جہاں سینگ سمائیں گے وہاں شرن لیں گے اور اگر کہیں سر چھپانے کی جگہ مل بھی گئی تو ایسے خونخوار جانور کو کون رکھنے دے گا۔وہ ہمارے لیے ایسا بوجھ بن جائے گا جس کو سنبھالنا مشکل ہوگا۔

''اوہ پاپا......جو ہونا ہوگا دیکھا جائے گا۔'' میری بیٹی اصرار کرنے لگی۔

''پاپا، تھوڑا سا جوکھم اٹھا لیں گے۔اس کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔'' میرا بیٹا پھر بول پڑا۔

''جب بچے اصرار کرتے ہیں تو لے چلیے۔تھوڑی بہت جگہ نکل ہی جائے گی۔'' میری بیوی سے رہا نہ گیا۔اس کی آنکھوں کے لال ڈورے صاف نظر آرہے تھے۔

مگر میرا دل نہیں مانا۔دہشت کی دُھند میں اپنا مستقبل ہی تاریک تھا۔اس لیے میں اپنی مصیبتوں کو مزید بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

''تم سمجھتی کیوں نہیں۔یہاں تو جان کے لالے پڑے ہیں۔جواہر ٹنل کے اس پار ہمارا کیا حشر ہوگا کسے معلوم۔راکی کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ یہیں رہے۔لوگ انسانوں کی کسمپرسی پر ترس نہیں کھاتے مگر جانوروں کی حالت بے زار نہیں دیکھ سکتے۔پاس پڑوس کے لوگ ضرور اس کو روٹیاں ڈال دیں گے اور پھر کچھ پڑوسیوں سے وہ ہل مل گیا ہے۔ہو سکتا ہے وہ اسے اپنے پاس رکھ لیں۔''

میری بیوی خاموش راکی کو لگاتار دیکھے جا رہی تھی اور تولیہ سے بار بار اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔وہ سارے مناظر جو راکی کے ساتھ وابستہ تھے اس کی آنکھوں کے سامنے فلمی ریل کی طرح دوڑنے لگے۔دل میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔عجیب مخمصہ تھا کہ اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

ہم نے جب راکی کو اپنے گھر لایا تھا وہ نہایت ہی چھوٹا سا پلّا تھا۔اس کی آنکھیں ابھی کھلی نہ تھیں۔میری بیوی اسے گود میں بٹھا کر بچے کی مانند بوتل سے دودھ پلاتی تھی۔روزانہ ٹب میں نہلاتی تھی۔بالوں میں برش پھیرتی تھی۔میرا بیٹا ہر روز قصائی کی دوکان سے اس کے لیے ہڈیوں والا

گوشت لے کر آتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ قد کاٹھی نکالنے لگا۔ گھر کے سبھی افراد کے ساتھ گھل مل گیا۔ بچے اس کو ربڑ کی گیند اور رنگ سے نئے نئے کرتب سکھانے لگے۔ کبھی وہ میرے پلنگ پر چڑھ کر بغل میں سو جاتا اور کبھی میرے منہ کو اپنی لمبی زبان سے چاٹ لیتا۔ اس وقت بچے بہت خوش ہو جاتے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ میں اس حرکت کو اپنی مرضی کے خلاف برداشت کر رہا تھا۔

''سنئے ہمیں راکی کے لیے کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔'' ایک دفعہ میری بیوی نے رازداری سے کہا۔ میں حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ آخر وہ کیا کہنا چاہتی تھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔

''راکی کسی لینڈی کتیا کے ساتھ گھل مل گیا تو اچھا نہ ہوگا۔''

میں نے اس کا اشارہ سمجھ لیا اور اپنی نادانی پر شرمندہ ہوا۔ دوسرے ہی دن سے راکی کے لیے پالتو کتیا ڈھونڈنے کے لیے کئی دوستوں سے بات کی۔

البتہ اس روز بدقسمتی سے ہم سب حالات کے قیدی بن چکے تھے۔ نہ اگلتے بنتی تھی اور نہ نگلتے۔ آخر کار میں نے اپنی کار پھاٹک سے باہر نکالی اور پھر اُتر کر پھاٹک ایسے بند کیا کہ راکی کبھی بھی آسانی سے پھاٹک کھول کر باہر نکل سکتا تھا۔ راکی کو میں نے چین سے نہیں باندھا تھا بلکہ بغیچے میں کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ پھاٹک کے اندر سے ایسی مسکینی صورت بنا کر بیٹھ گیا جیسے اسے آنے والی آفتوں کی پہلے ہی سے پیش آگاہی ہو چکی ہو۔ وہ بول تو نہیں سکتا تھا لیکن اس کی آنکھوں کی نمی سب کچھ کہہ رہی تھی۔

میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسٹریٹ لائٹ کی بیمار روشنی میں ایک بھرپور نظر راکی پر ڈالی۔ پھر کار اسٹارٹ کی اور رات کے اندھیرے کو چیرتا ہوا چلا گیا۔

راکی بہت دیر تک کار کو دیکھتا رہا۔ اس معصوم نے خواب وخیال میں بھی سوچا نہ ہوگا کہ ہم اس بے زباں کو ہمیشہ کے لیے بے یار و مددگار اس طرح چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اس سے پہلے بھی ہم کئی بار کسی دوست یا رشتہ دار کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے اسے یونہی اکیلا چھوڑ کر چلے جاتے تھے اور پھر دوسرے دن لوٹ آتے تھے۔ مگر آج بات ہی دوسری تھی۔ میں خود استحقاری کی وجہ سے

پریشان تھا اور وہ لاچاری کی وجہ سے۔

''پاپا ہم نے یہ اچھا نہیں کیا۔آپ نے اس کے بھونکنے کی آواز پر غور نہیں کیا۔اس کی آواز آج کچھ الگ سی لگ رہی تھی۔وہ رو رہا تھا پاپا۔ہی واز کرائینگ پاپا، ہی واز ریئلی کرائینگ (He was crying papa , he was really crying) ۔''میری بیٹی کی آواز میں کرب تھا، مایوسی تھی اور محرومی تھی۔کچھ دیر کے بعد وہ پھر بولی۔''پاپا را کی واز کرائینگ (Papa, Rocky was crying!)۔میری بیٹی ہسٹیریکل ہوگئی۔وہ بہت ہی حساس ہے۔شاید اس نے را کی کی بدلی ہوئی آواز کو پہچان لیا تھا۔کہتے ہیں کتے کی چھٹی حس آنے والے مصائب کا اندازہ لگا سکتی ہے۔

میری بیوی نے اس کو سنبھالا۔تھرماس سے پانی پلایا اور پھر اپنی گود میں اس کا سر رکھ کر اس کو تھپکیاں دینے لگی۔

''میں نے را کی کو وہاں کیوں چھوڑا...؟'' سفر کے دوران میں میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ پھر خود ہی اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔'' کچھ مجبوری تھی اور کچھ مصلحت۔میں نے سوچا کُتا ہے۔کسی فرقے یا مذہب سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔کوئی تو ہوگا جو اسے پناہ دے گا۔اس کو پناہ دینے میں کسی کو کوئی عذر نہیں ہوگا۔پناہ دینے والے پر کسی کا عتاب نازل نہیں ہوگا کیونکہ وہ جانور ہے آدمی نہیں۔ اور اگر ایسا کوئی بھی شخص نہ ہوا تو بھی را کی آزادانہ طور پر سڑکوں پر گھوم پھر سکے گا یا پھر کسی فوجی کیمپ کی رکھوالی میں کام آئے گا۔اس دنیا میں رحمدل لوگوں کی کوئی کمی نہیں۔وہ چند روٹی کے ٹکڑے ڈال ہی دیں گے۔افسوس مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ را کی ہمارے گھر کی چوکھٹ سے بندھا اپنی زندگی کی آخری سانسیں گنتا رہے گا۔

اس کے بعد کیا ہوا مجھے یا گھر کے کسی اور فرد کو کچھ نہیں معلوم البتہ شفیع قریشی نے باقی ماجرا سنایا۔

''جس روز آپ لوگ چلے گئے اس کے اگلے ہی دن کرفیو میں ڈھیل دی گئی۔میں آپ کے گھر کی طرف چلا گیا۔وہاں کیا دیکھا کہ پھاٹک بند تو تھا لیکن کنڈی نہیں چڑھی تھی۔پورے مکان سے

خاموشی ٹپک رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ آپ لوگ بھی بغیر اطلاع دیے نقل مکانی کر چکے ہوں گے۔ادھر پھاٹک کی سلاخوں کے پیچھے راکی صاف نظر آرہا تھا۔اس نے جونہی مجھے دیکھا زورزور سے بھونکنے لگا۔ میں نے 'راکی'، 'راکی' پکار کر اس کو بہت بار بلایا مگر وہ صرف بھونکتا رہا۔ میرے جانے کے بعد بھی وہ بسورتا رہا، بین کرتا رہا۔

بہت عرصے تک میں روزانہ اس کو دیکھنے کے لیے چلا جاتا۔صبح وشام اس کے لیے روٹیاں لے جاتا مگر کیا مجال اس نے ایک بھی روٹی کو منہ لگایا ہو۔وہ روز بروز سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔مجھ سے رہا نہ گیا۔ پھاٹک کو تھوڑا اور کھول کر رکھ دیا۔سوچا کہ اسے باہر نکلنے کا راستہ مل جائے گا اور آسانی سے گھوم پھر سکے گا۔یا میرے ساتھ ہی چلا آئے گا یا کہیں اور چلا جائے گا نہیں تو گلی کے کتوں کے ساتھ رل مل جائے گا اور اپنی زندگی کے نئے باب کی شروعات کرے گا۔مگر وہ تو عجیب ٹائپ کا کُتا نکلا۔گھر سے باہر ایک بھی قدم نہ رکھا۔نہ کچھ کھاتا تھا نہ پیتا تھا۔بس پھاٹک کے پاس بیٹھ کر باہر کی جانب آس باندھے دیکھتا رہتا۔دھیرے دھیرے وہ پنجر ہوتا گیا۔بالکل پنجر۔اور پھر ایک روز جب میں نماز پڑھ کر پاس سے گزرا تو میں نے اس کو پھاٹک کے اس طرف مردہ پایا۔وہ مر چکا تھا تاہم اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور اس وقت بھی پھاٹک کے باہر کچھ ڈھونڈتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔لگتا تھا جیسے ابھی بھی اسے اپنے مالک کے آنے کی امید تھی۔''

''اوہ گاڈ.....!'' میرے منہ سے چیخ نکلی اور آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔

دریں اثنا ٹرین کا ٹائم ہو گیا۔محمد شفیع گاڑی میں بیٹھ گیا۔بغل والے زنانہ ڈبے میں پنکی نے اپنی نشست لے لی۔پھر گاڑی حرکت میں آگئی۔ میں اور آشوتوش باہر پلیٹ فارم پر کھڑے ہاتھ ہلاتے رہے جب تک گاڑی ہماری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

میں ایک آہ بھر کر آشوتوش سے مخاطب ہوا۔

''وہاٹ اے ٹریجڈی (What a tragedy) مجھ سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہوگیا۔اگر مجھے

معلوم ہوتا کہ جموں میں آکر مجھے کرائے پر اچھا علاحدہ مکان مل جائے گا تو میں ہرگز راکی کو چھوڑ کر نہیں آتا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا ضمیر بار بار مجھے کچوکتا رہا۔ میں نے کئی بار راکی کو لانے کا ارادہ بھی کیا مگر بگڑے ہوئے حالات کے مدنظر ہمت نہ بٹور پایا۔ مگر دیکھو شفیع صاحب کتنے نیک اور بامروّت انسان ہیں۔ راکی کے ذکر ہی سے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ مجھے اس کی باتوں پر پورا یقین ہے۔ اس نے راکی کو بچانے کی پوری پوری کوشش کی ہوگی۔''

''انکل کم آن......! کس زمانے کی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ انسان اور رحم......! آپ تواریخ کا کوئی بھی صفحہ الٹیے۔ وہ انسان کی بربریت اور وحشت کی گواہی دے گا۔ مانا محمد شفیع نے کُتے کے لیے آنسو بہائے ہوں گے مگر اس نے آپ کی فیملی کے بارے میں کچھ بھی نہ پوچھا۔ کوئی استفسار نہ کیا۔ آپ لوگ بھی تو جان جوکھم میں ڈال کر نکل آئے تھے۔ کون جیا اور کون مرا، کم سے کم اتنا تو پوچھ لیا ہوتا۔'' یہ نوجوان آشوتوش کا ردِ عمل تھا۔ وہ مجھ سے کئی سال چھوٹا ہے۔

حالانکہ میں آشوتوش کے نظریے سے بالکل اتفاق نہیں کرتا پھر بھی اس کے اندازِ فکر کو ایک دم مسترد نہیں کر سکتا۔ ہوسکتا ہے وہ صحیح ہو یا پھر ہوسکتا ہے میں صحیح ہوں یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم دونوں ہی صحیح ہوں۔ میں آج تک کچھ بھی فیصلہ نہ کر پایا۔

☆☆☆☆☆

فریبِ گفتار

میجر دیوانگ شوم کے ساتھ میری دوستی ڈیوٹی روم میں ہوئی تھی۔ بہت ہی چالو قسم کا آدمی تھا۔عورتوں پر ایسے ڈورے ڈالتا کہ دیکھتے ہی بنتا تھا۔کیا مجال کہ اس نے کسی پر نیت باندھی ہو اور وہ اس کے چنگل سے بچ نکلے۔عورتوں کے انتخاب میں اسے خاصی مہارت تھی۔دانہ وہیں ڈالتا تھا جہاں کبوتری پھنسنے کی پوری امید ہوتی۔ ہماری دوستی کی وجہ بھی یہی مشترکہ شوق تھا۔اس نے کہیں سے سنا تھا کہ مجھے خوباں کی چھیڑ چھاڑ میں کافی دلچسپی رہتی ہے۔

ایک روز وہ صبح سویرے مجھ سے ملنے ڈیوٹی روم میں چلا آیا۔

''گڈ مارننگ، میجر پرتاپ۔''

''گڈ مارننگ میجر دیوانگ۔تم سنڈے کو یہاں اور وہ بھی وردی میں؟''

''تمہیں ریلیو کرنے آیا ہوں۔دراصل آج میجر شرما کی ڈیوٹی تھی مگر وہ ایم ایچ (ملٹری ہاسپٹل) میں داخل ہو چکا ہے۔اس لیے خود ہی آنا پڑا۔''

''اوہ، آئی سی...!''

''تمہاری آنکھوں سے لگ رہا ہے کہ پوری رات جاگے ہو۔''

''کچھ مت پوچھو۔رات بھر ٹیلیفون بجتا رہا۔''

''آفس کے ٹیلیفون تھے یا پرسنل۔ سننے میں آیا ہے کہ اسٹیشن میں تمہاری کافی ڈیمانڈ رہتی ہے۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بھلا مجھے کون پوچھے گا۔''

''یار کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔میں نے تو سنا ہے کہ جو تمہیں دیکھتا ہے وہ تم پر مرمٹتا ہے۔اس کا

راز کچھ ہم کو بھی بتاؤ۔''

اس طرح دونوں غیر رسمی بات چیت میں محو ہو گئے۔ میں نے اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کام کا آدمی ہے۔

اتنی دیر میں میس (Mess) سے ناشتہ آ گیا۔ میں نے چائے کی پیالی اسے بھی پیش کی۔

''سنا ہے تمہاری فیملی آج کل یہاں نہیں ہے۔''

''آگرہ ٹریننگ کے لیے گئی ہے۔''

''بچے کہاں ہیں؟''

''وہ بھی اسی کے ساتھ گئے ہوئے ہیں۔''

''پھر تو تمہارے مزے ہی مزے ہیں۔ اکیلے میں گل چھرے اڑاتے ہوگے۔''

''یہی تو رونا ہے بھائی۔ آج کل اکال سا پڑ گیا ہے۔ کہیں کوئی نظر ہی نہیں آتا۔''

''ایسی بھی کیا بات ہے۔ مجھے کہا ہوتا مال کا انتظام کروا دیتا۔''

''سچ....!''

''کیوں نہیں.....! شیلانگ میں قحط کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بڑی زرخیز زمین ہے یار۔''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں، کھاسی بڑے خوبصورت اور دل پھینک قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔''

''یس، یو آر رائٹ۔ ناک نقشہ بالکل منگولوں کا اور پہناوا چینیوں جیسا۔ بڑے سج دھج کے رہتے ہیں۔''

''کیوں، ابھی تک کسی سے واسطہ نہیں پڑا؟''

''ابھی تک تو نہیں البتہ راستے میں لوگوں کو چلتے پھرتے ضرور دیکھ لیتا ہوں۔ بڑے ہی خوش خلق اور ملنسار لگتے ہیں۔ عیش پرست...! اپی کیورس (Epicurus) کی اولاد...! فردا کی فکر بھی نہیں کرتے۔''

''ٹھیک ہے، میں دو چار دن میں انتظام کرلوں گا۔ سیدھے تمھارے گھر لے آؤں گا۔ کوئی پرابلم تو نہیں ہوگی۔''

''پرابلم کیسی۔ ہاں صرف اتنا کرنا کہ آنے سے پہلے ٹیلیفون پر اطلاع ضرور دینا۔''

''ٹھیک ہے۔''

اگلے ہفتے سنیچر کی رات کو ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب دیوانگ بول رہا تھا۔ ''بیس پچیس منٹ میں تمھارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ ابھی تک ایک ہی ملی۔ اس کی سہیلی کا انتظار کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بھی ہو سکتی ہے۔''

آدھے گھنٹے کے بعد دیوانگ ایک کھاسی لڑکی کے ہمراہ میرے گھر میں داخل ہوا۔ میری نگاہیں دوسری لڑکی کو تلاشنے لگیں۔ دیوانگ سمجھ گیا۔ اس لیے خود ہی بول پڑا۔ ''یار وہ تو آئی نہیں۔ حالانکہ اس نے کرسٹی کو ٹیلیفون پر آشواسن دیا تھا کہ دس پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤں گی مگر نہیں آئی۔'' سڑک پر زیادہ دیر کھڑے رہنا، وہ بھی کھاسی لڑکی کے ساتھ، خطرے سے خالی نہیں۔ اس لیے دونوں اسکوٹر پر چلے آئے۔

''میجر دیوانگ، ہم تم کو بولا تھا تھوڑا اور انتظار کرو۔ وہ آئے گی، ضرور آئے گی۔ آئی نو مائی فرینڈ ویری ویل۔ تم کو تو جلدی مچی تھی۔'' لڑکی کے لہجے میں ناراضی صاف جھلک رہی تھی۔

میں نے بیچ میں بات کاٹ کر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''ڈونٹ وری۔ آپ کیا پینا پسند کریں گی۔ وہسکی یا رَم؟''

شمال مشرق کی قبائلی لڑکیاں شراب ایسے پیتی ہیں جیسے مچھلیاں پانی پیتی ہیں۔

''رَم۔ آئی لائک رَم۔''

میں نے اپنا وائن کیبنٹ کھولا۔ رَم کے تین گلاس سوڈا ملا کر تیار کیے اور کرسٹی اور دیوانگ کے ہاتھوں میں تھما دیے۔ ''چیئرز.....!''

''چیئرز.....!'' دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

یہ پینٹنگ کس نے بنائی ہے؟'' کرسٹی نے آتش دان کے کارنس کے اوپر ٹنگی ہوئی پینٹنگ کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ میں نے بنائی ہے۔اس کمرے میں جتنی بھی پینٹنگز ہیں سب میری بنائی ہوئی ہیں البتہ جو ہینڈی کرافٹ ورک ہے وہ میری بیوی کا ہے۔''

''یو آر بوتھ آرٹسٹس ۔ہاؤ نائس۔''

''یہ میری ہابی ہے۔بچپن ہی سے مجھے پینٹنگ کے ساتھ لگاؤ رہا ہے۔''

''پرتاپ کچھ سنیکس (Snacks) وغیرہ تو گھر میں ہوں گے؟'' میجر دیوانگ کو ہماری گفتگو میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' میں اٹھ کر کچن سے آلو چپس اور فرائیڈ مونگ پھلی لے کر آیا۔

اتنی دیر میں دیوانگ نے کرسٹی کے ساتھ کسی اور موضوع پر گفتگو شروع کی تھی۔ میں جونہی واپس اپنی نشست پر بیٹھ گیا کرسٹی نے اپنا منہ میری جانب پھیر لیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''میں اتنی دیر سے یہاں بیٹھی ہوں پھر بھی ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔آپ نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔''

''اوہ ہاں۔ میں تو بھول ہی گیا۔آپ کے بارے میں بھی مجھے کچھ علم نہیں ہے۔''

''میں ہوں کرسٹی۔لائی مکرا میں میری رہائش ہے۔کئی آرمی افسروں سے میری دوستی ہے۔آج ڈیفنس سینما میں بائی چانس میجر دیوانگ سے ملاقات ہوئی۔ دیٹ از ہاؤ آئی ایم ہیئر۔''

''میرا نام ہے میجر پرتاپ آہلووالیہ۔تقریباً ایک سال سے شیلانگ میں ہوں۔ ویسے دہلی کا رہنے والا ہوں۔''

''آئی سی۔'' اس نے سارا گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔اس کا ساتھ دینے کے لیے ہم

نے بھی اپنے گلاس خالی کر دیے اور پھر میں نے دوبارہ تینوں گلاسوں میں رَم بھر دی۔

اس کی پینے کی رفتار بہت تیز تھی۔ ہم اگر چاہتے بھی اس کا ساتھ دینا مشکل تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اب وہ نہیں بلکہ شراب بول رہی ہے۔ جب تک شراب کے دور چلتے رہے وہ نت نئے موضوعات پر میرے ساتھ بحث کرتی رہی۔ دیوانگ الگ تھلگ سا پڑ گیا۔ اس نے بارہا کوشش کی کہ کرسٹی اس کی طرف متوجہ ہو لیکن وہ اسے نظر انداز کرتی رہی۔ دیوانگ کی فرسٹریشن اس حد تک بڑھی کہ اگر اس کے پاس ریوالور ہوتا وہ ہم دونوں کو وہیں پر شوٹ کر دیتا۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا۔ وہ اٹھا اور کرسٹی کی بانہہ پکڑ کر اس کو اپنے ساتھ ملحق کمرے میں لے جانے کے لیے زور زبر دستی کرنے لگا۔

''کم وِدمی۔ چلو اندر کمرے میں چلیں۔ اپنا گلاس بھر لو۔''

''نو، ناٹ ایٹ آل۔ میں تمھارے ساتھ نہیں جا سکتی۔'' کرسٹی کے لہجے میں روکھا پن تھا۔ وہ پہلے سے ہی خار کھائے بیٹھی تھی کیونکہ میجر دیوانگ نے جلدی مچائی تھی اور اس کی فرینڈ کا انتظار نہیں کیا تھا۔

جواب سن کر میجر دیوانگ کے کان کھڑے ہو گئے۔

''کیوں.......؟'' دیوانگ نے پوچھا۔

''آج میں جانے کے قابل نہیں۔ میری صحت اچھی نہیں۔''

''یو آر کِڈنگ۔ مذاق مت کرو۔ چلو بھی اب۔''

''نہیں دیوانگ۔ آئی ایم سیریس۔ میرے پیریڈس شروع ہو چکے ہیں۔ میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میں تو بس ڈرنک کرنے کے لیے آئی تھی۔ پھر کبھی آؤں گی۔ یو ہیو مائی ٹیلیفون نمبر۔''

دیوانگ نے منانے کی بہت کوشش کی۔ ہاتھ جوڑے، منتیں کیں، کرسٹی کے لبوں پر بوسے دیے مگر وہ ایک نہ مانی۔ پھر دیوانگ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ ایسی حالت میں آدمی اتنا لاچار اور بے

بس ہوسکتا ہے مجھے پہلی بار معلوم ہوا۔ خیر میں نے چُپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔

''اچھا چلو میں تمھیں گھر چھوڑ آؤں گا۔''

''ٹائم معلوم ہے کیا ہوا؟ رات کے ساڑھے بارہ بج چکے ہیں۔ اس وقت میں گھر کیسے جاؤں گی۔''

''تو پھر کہاں جاؤ گی؟''

''رات بھر یہیں رہنا پڑے گا۔'' وہ میری طرف لاتعلقی سے مڑی اور پوچھنے لگی۔'' آپ کو کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی میجر پرتاپ۔''

''نہیں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ تم جیسا مناسب سمجھو، کرلو۔''

میجر دیوانگ غصے کی حالت میں باہر چلا گیا اور اسکوٹر اسٹارٹ کرکے ہوا ہوگیا۔ رات بھر کرسٹی میرے ساتھ لپٹ کر سوتی رہی۔ اس کے بدن سے چنگاریاں اٹھ رہی تھیں جن کو ٹھنڈا کرنے کی میں نے حتی الامکان کوشش کی۔ اسی درمیان میں میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔''تم نے دیوانگ سے جھوٹ کیوں بولا؟''

''ہی اِزاے بِگ بور۔ مجھے تمھاری باتیں بہت پسند آئیں۔ یو آر اے لیرنیڈ مین۔ مجھے وہ آدمی پسند آتے ہیں جو اچھی گفتگو کرسکیں اور نالج ایبل ہوں۔ تمھیں دیکھتے ہی میں نے آج رات تمھارے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔''

''اس بے چارے کا دل ٹوٹ گیا ہوگا۔''

''ٹوٹنے دو، میری بلا سے۔ اس نے خود ہی جلد بازی کی۔ میری سہیلی پکا آئی ہوگی۔ اس نے مجھے بولا تھا۔ کہیں کوئی پرابلم ہوئی ہوگی۔ آئی واز ویری اَپ سیٹ۔ اسی بات پر مجھے دیوانگ سے نفرت سی ہوگئی۔ مگر مجبوری تھی۔ ساتھ چلنے کے لیے رضامندی جو دکھائی تھی۔ اس لیے چلنا پڑا۔

دوسرے روز میجر دیوانگ شوم نے مجھے اپنے آفس میں بلایا۔ مجھے دیکھتے ہی شروع ہوا۔'' یار، تم

عجیب ٹائپ کے آدمی ہو۔''

''کیوں....میں نے کیا کیا؟''میں نے معصوم سا چہرہ بنا کر پوچھ لیا۔

''کل تم نے کرسٹی کو اپنے پاس رکھ لیا اور مجھے بھگا دیا۔''

''میں نے......!تم ہوش میں تو ہونا۔'' یہ تو اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ پھر تم نے بھی تو غلطی کی تھی۔اس کی سہیلی کا انتظار نہیں کیا تھا۔وہ اسی بات پر تم سے ناراض تھی۔''

''ہاں یار۔غلطی تو مجھ سے بھی ہوئی۔انتظار کیا ہوتا تو دوسری لڑکی بھی ساتھ آتی۔دراصل وہ اکیلی تھی۔اس لیے دونوں کے ساتھ سونے میں کترانے لگی۔''

''تمھارا ابھی تو قصور ہے پرتاپ۔تم بہت باتیں کرتے ہو اور وہ بھی میٹھی میٹھی۔تم نے اپنی باتوں ہی سے کرسٹی کا دل جیت لیا۔وہ اسی لیے رات بھر تمھارے ساتھ رہی۔حیض کا تو بہانہ تھا۔میں اس کی باتوں سے سمجھ گیا تھا۔''

''تم ایکسپرٹ ہو دیوانگ۔میں نسوانی نفسیات کے ابجد سے بھی واقف نہیں۔''

''آگے کے لیے ہمیں پہلے ہی سے فیصلہ کرنا پڑے گا۔''

''کس بات کا فیصلہ؟''

''اگر میں آئندہ کوئی چھوکری لے کر آؤں تم اس کے ساتھ باتیں نہیں کروگے۔نہ کوئی ٹاپک چھیڑوگے اور نہ ہی میٹھی میٹھی حکائتیں سناؤگے۔تم بس اپنی چھوکری سے مطلب رکھنا اور میری والی سے ہرگز باتیں نہ کرنا۔اگلی بار ایک سے کام نہیں چلے گا۔''

اس کے بعد وہ سنیچر کی رات کو ایک ساتھ دو لڑکیاں لے کر حاضر ہوا۔''ہائے پرتاپ،میٹ مائی فرینڈ،کم شملونگ۔شی اِز این ایئر ہوسٹس وِد ائیر انڈیا۔اور یہ ہے مَیشلوؤ نا۔کم کی فرینڈ۔''

''میرے ہونٹوں سے ابھی'ہائے' نکلا ہی تھا کہ مجھے دیوانگ سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔میں نے اپنے ہونٹ سی لیے۔پھر تینوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔رسمی تعارف کے بعد چاروں وہسکی پینے میں

مصروف ہو گئے۔

آج صرف دیوانگ باتیں کر رہا تھا اور میں چُپ چاپ 'ہوں' 'ہاں' کرتا رہا۔اس نے این ڈی اے (NDA) کی لائف کے بارے میں کم کو کہانیاں سنائیں۔انیس سو اکہتر کے بنگلہ دیش جنگ کے بارے میں قصے سنائے۔ہم سبھی کان دھرے سن رہے تھے۔ کم کبھی کبھار کچھ وضاحت چاہتی جبکہ میشلونا خاموشی سے شراب پئے جا رہی تھی۔ گفتگو سے پتہ چلا کہ کم اور دیوانگ چند روز پہلے ہی ٹیکسی میں گوہاٹی سے شیلانگ سفر کرتے ہوئے ملے تھے۔اسی ملاقات کا نتیجہ یہ دوستی تھی۔آج دیوانگ وہسکی اور سینڈوچ بھی اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔ کم شملونگ کی مخمور نگاہیں گفتگو کے دوران کئی بار میری جانب اٹھیں۔ میں نے ان کا استقبال دبی دبی مسکراہٹ سے کیا۔اس کے پینے کی رفتار سست تھی جبکہ آج دیوانگ پیگ پر پیگ لٹائے جا رہا تھا۔

''آپ نے مون برت رکھا ہے کیا؟ کچھ بولتے ہی نہیں۔'' کم نے وہسکی سے تر ہوئے ہونٹوں کو اپنے رومال سے پونچھتے ہوئے سوال کیا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' گلاس کے ساتھ منہ چپکا کر میں نے اس کی بات کاٹ لی۔

''دیوانگ گھبرا گیا کہ گفتگو آگے نہ بڑھے۔اس نے بیچ میں ہی ٹوکا۔''میجر پرتاپ زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں۔''

کم نے پھر اپنی مانوس نگاہوں سے میرا جائزہ لیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس کے دل میں کچھ کچھ ہونے لگا تھا جس کا اظہار وہ اپنی مخمور آنکھوں سے کر رہی تھی۔

دیوار گھڑی نے رات کے سینے پر گیارہ ضربیں لگا دیں۔ دیوانگ نے بڑے ادب سے کم کو ملحق کمرے میں چلنے کی دعوت دی مگر کم نے بڑی سنجیدگی اور پختہ کاری سے جواب دیا۔''نہیں میں تمھارے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔تم میشلونا کو ساتھ لے کر جاؤ۔''

''کیوں تم کیوں نہیں آؤ گی؟''

’’مجھے پرتاپ کی کمپنی اچھی لگتی ہے۔ ہی اِز اے نائس گائے۔کم گو، میچور اور سنجیدہ۔آئی لائک ہم۔میں اسی کے ساتھ رہوں گی۔‘‘

ان الفاظ سے دیوانگ پر بجلی سی گری۔وہ بوکھلا اٹھا۔اس کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔اس کا بس چلتا تو ِکم کے کپڑے تار تار کر کے اس کا وہیں بلاتکار کر لیتا مگر تہذیب کی بیڑیاں پاؤں میں پڑی تھیں۔زہر کا گھونٹ پی کر ضبط کر لیا۔اس کے ردِ عمل سے میں پریشان ہوگیا۔میں نے ِکم شملونگ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانی۔آخر کار دیوانگ لاچار ہو کر میشلونا کے ہمراہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔میں اور ِکم اپنے اپنے گلاس اٹھا کر بیڈروم میں چلے گئے۔اور بوس و کنار میں محو ہو گئے۔ ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔’’کون...؟‘‘میں نے آواز دی۔

’’میں ہوں....دیوانگ۔‘‘

’’اب کیا ہوا....؟‘‘

’’ہم لوگ جا رہے ہیں۔ِکم کہاں ہے؟‘‘

’’یس دیوانگ، میں یہاں ہوں۔‘‘ ِکم نے جواب دیا۔

’’چلو، تمھیں گھر چھوڑ دوں۔‘‘

’’نہیں، مجھے ابھی نہیں جانا۔میں رات بھر یہیں ٹھہروں گی۔‘‘ ِکم نے نیم خوابی میں پھر جواب دیا۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔دیوانگ اور میشلونا جانے کے لیے تیار تھے جبکہ ِکم بستر میں نیم دراز اپنے عریاں بدن کو چادر سے ڈھانک رہی تھی۔

اندھیرے میں اسکوٹر کی آواز بہت دیر تک سنائی دی۔ان دونوں کے جانے کے بعد ہی رات جاگ گئی۔

☆☆☆☆☆

سفید کراس

''سنیے....!'' گھبرائی ہوئی شیورانی نے اپنے شوہر سری کنٹھ کو جھنجھوڑ کر کہا۔ ''کب تک سوتے رہیں گے؟ اب اُٹھیئے بھی۔ باہر کی کچھ خبر بھی ہے آپ کو؟'' اس کے برگ گل جیسے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

''کہو کیا بات ہے؟ تم اتنی گھبرائی کیوں ہو؟ سری کنٹھ نے آنکھیں موندتے ہوئے اپنا لحاف ایک طرف ہٹا دیا۔

''میں ابھی ابھی باہر گئی تھی........'' شیورانی کے ہونٹوں پر بدستور لرزش تھی۔

''اس میں گھبرانے والی کونسی بات ہے۔'' سری کنٹھ نے اپنے چہرے پر بشاشت کا ملمع چڑھاتے ہوئے کہا حالانکہ وہ بیوی کا چہرہ دیکھتے ہی اندیشوں اور وسوسوں میں گھِر گیا تھا۔

''باہر گیٹ پر........شیورانی آگے کچھ بھی نہ بول پائی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے۔ قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو جاتی، سری کنٹھ نے اسے سنبھالا اور اپنی چھاتی سے لگایا۔

وہ باہر جانے کے لیے اٹھنے لگا مگر شیورانی نے اسے روک لیا۔

''نہیں نہیں آپ وہاں نہیں جائیں گے۔ بھگوان نہ کرے آپ کو کچھ ہو جائے تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔''

''اری کچھ نہیں ہوگا۔ ذرا دیکھ تو لوں آخر گیٹ پر ایسی کیا بات ہے جس سے تم اتنی گھبرائی ہوئی ہو۔''

''اجی نہیں۔ آپ مت جایئے۔ آپ کمرے کے باہر قدم بھی نہیں رکھیں گے۔ آپ کو میری قسم!''

''پھر تم ہی بتاؤ کیا بات ہے۔''

''وہاں گیٹ پر کسی نے چاک سے سفید کراس بنایا ہے۔''

سری کنٹھ کے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی۔ اُن دنوں شہر میں افواہ گرم تھی کہ ملی ٹنٹ جس مکان پر سفید کراس کا نشان لگاتے ہیں، اس مکان کے کسی فرد کی موت یقینی ہوتی ہے۔

فضا میں خوف و دہشت محلول تھی۔ کس بات پر بھروسہ کریں اور کس بات پر نہیں، یہ طے کر پانا مشکل تھا۔ ہر سمت افواہیں وباء کی طرح پھیل رہی تھیں۔ ہر افواہ کے ساتھ یہی کہا جاتا تھا کہ سرحد پار سے فرمان جاری ہوا ہے۔

''بچے کدھر ہیں؟'' ہڑبڑاہٹ میں سری کنٹھ سب سے پہلے اپنے بچوں کو ڈھونڈنے لگا۔ دو معصوم لڑکیاں تھیں، کاکی اور ببلی، جنھوں نے ابھی زندگی کی چند ایک بہاریں ہی دیکھی تھیں۔ بڑی بارہ برس کی تھی اور چھوٹی نو برس کی۔

انسانی فطرت بھی عجیب ہے۔ جب زندگی کے لالے پڑتے ہیں تو سب سے پہلے آنے والی نسل کو محفوظ رکھنے کی سبیلیں کی جاتی ہیں۔ اپنی زندگی پر بچوں کی زندگی کو ترجیح دی جاتی ہے۔

''آج کے بعد انھیں ہرگز باہر نہیں جانے دینا۔'' سری کنٹھ نے تنبیہ کی اور خود اسی ادھیڑ بن میں کمرے میں چکر لگاتا رہا کہ نہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔

''مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہی ہوگا مگر بشمبر نے مجھے روک لیا۔ ورنہ میں کب کا یہاں سے چلا گیا ہوتا۔'' وہ اپنے ساتھ بڑبڑانے لگا۔ پھر بیوی کی طرف مخاطب ہوا۔ ''بشمبر کو خبر دیں۔ اب تو جانا ہی پڑے گا۔''

''کس بشمبر کو.....؟'' بشمبر کا نام سنتے ہی شیورانی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''کتنے سادہ لوح ہیں آپ۔ بشمبر ....! ہونہہ......!''

''کیوں...کیا ہوا بشمبر کو؟''

''ہونا کیا تھا۔ وہ لوگ تو اندھیرا چھٹنے سے پہلے ہی گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔''

''سچ کہتی ہو؟'' اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کا سگا بھائی ایسا کر سکتا ہے۔ وہ کئی دنوں سے بشمبر ناتھ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اب یہاں ہماری خیر نہیں۔ سبھی لوگ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہمیں بھی جتنی جلدی ہو سکے جانا چاہیے۔

بڑے بھائی سے ہمیشہ ٹکا سا جواب ملتا۔ ''سری، تم ڈرپوک ہو۔ ایسی وارداتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ آزادی سے پہلے بھی ہوئیں اور آزادی کے بعد بھی ہوئیں۔ دس پندرہ روز میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

سری کنٹھ چنانچہ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں ہیڈ کلرک تھا اس لیے تازہ خبریں بادِ سموم کی طرح دیر سویر اس کے پاس پہنچ جاتی تھیں۔ اس بات میں اب کوئی شک وشبہ نہیں تھا کہ اس کی ذات برادری والوں کو وادی سے ہجرت کرنا پڑے گی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بار بار اپنے بھائی سے مشورہ لیتا تھا۔

سری کنٹھ کو اس بات کا رتی بھر بھی ملال نہ ہوا کہ اس کے بھائی نے جانے سے پہلے اسے اطلاع نہ دی۔ وہ بھائیوں کی طرح رہے ہی کب تھے۔ علاوہ ازیں یہ اس کی ذات برادری والوں کی نمایاں خصوصیت تھی کہ جیو تو اکیلے جیو اور مرو تو اکیلے مرو۔ وہ ذات کا برہمن تھا۔ برہمنوں میں راجپوتوں کی طرح بھائی چارہ نہیں ہوتا۔ ہر شخص اپنے آپ کو تیس مار خان سمجھتا ہے۔ فرد کے آگے قوم اور ملت کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ سری کنٹھ اور بشمبر ناتھ کے پریواروں کا میل ملاپ صرف شوراتری کی پوجا تک محدود تھا اور وہ بھی مجبوری کے سبب۔ روایت کے مطابق ایک ہی مکان میں ایک ہی خاندان کے لوگ دو جگہ 'وٹک' نہیں بھر سکتے تھے یعنی شو پوجا نہیں کر سکتے تھے۔

سری کنٹھ اپرادھیوں کی طرح اپنی بیوی کے روبرو کھڑا تھا۔ اسے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ ٹیلیفون کرنا چاہا، لائن خراب تھی۔ باہر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کرتا بھی تو کیا کرتا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے آپ کو بے یارو مددگار پانے لگا۔ اس کی بیوی بھی آتش زیر پا تھی۔

کبھی شوہر کے کمرے میں داخل ہوتی اور کبھی بچوں کے کمرے میں چلی جاتی۔

گولیوں کی آوازیں پیہم چلی آرہی تھیں۔اسٹین گن کی مسلسل فائرنگ سے کان جھنانے لگے تھے۔بھگوان ہی جانتا تھا کہ گولیاں کون چلارہا ہے۔ملی ٹنٹ یا حفاظتی دستے؟ بہر حال گولیاں چلنے کی آوازیں کئی بار آئیں اور کہیں نزدیک ہی راکٹ کے پھٹنے کی آواز بھی آئی۔دھماکے سے سارا مکان ہل گیا۔

شیورانی نے مکان کی ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کردیے۔ہر ایک کھڑکی پر پردے ڈال دیے تاکہ مکان کے اندر روشنی کی کرن بھی داخل نہ ہو۔میاں بیوی دونوں مبہوت وہیں چٹائی پر دُبکے بیٹھے رہے۔

باہر کے حالات کے بارے میں صرف ٹی وی یا ریڈیو پر کوئی خبر مل سکتی تھی مگر ان کا سوئچ آن کرنے کی کس میں ہمت تھی۔اندیشہ یہ تھا کہ کہیں کوئی آواز باہر گئی تو نہ جانے کیا قیامت برپا ہوگی۔

شیورانی کو نہ جانے کیا سوجھی۔وہ اٹھی اور اپنے گہنے اور نقدی پوٹلی میں باندھ کر لے آئی۔ایسی صورت میں عورت استری دھن کو ہی اپنا آخری سہارا مان لیتی ہے۔کچھ توقف کے بعد وہ پھر دبے قدموں سے اندر جاکر کچھ ہنگامی کپڑے سمیٹ کر لے آئی اور اس کی گٹھڑی باندھنے لگی۔سری کنٹھ کو اس کی ان حرکتوں پر تعجب ہورہا تھا لیکن وہ چپ چاپ دیکھتا رہا۔

ان حالات میں وقت کٹتے نہیں کٹتا۔جب موت سر پر منڈلاتی ہے تو جیون بھاری بوجھ سا لگتا ہے۔ہر سانس چبھنے لگتا ہے۔آنکھوں کا جھپکنا بھی برداشت نہیں ہوتا۔

دریں اثنا بچے بھی جاگ اٹھے۔ماحول کی خاموشی دیکھ کر انھوں نے حالات کا خود ہی اندازہ لگالیا۔بلی کو دو چار روز پہلے ہی اسکول میں کسی سہیلی نے متنبہ کیا تھا۔"بلی تم لوگوں کو یہاں سے جانا پڑے گا۔

میرے بھیا کہتے تھے کہ جیسے افغانستان سے روسی فوجوں کو کھدیڑ دیا گیا ویسے ہی ہندستانی فوج کو بھی

کشمیر سے جانا پڑے گا۔ وادی میں بہت سارے افغانی مجاہد گھس آئے ہیں۔ وہ ہمیں آزاد کرائیں گے۔''

ببلی نے جونہی یہ خبر اپنے والدین کو سنائی وہ بھی چوکنا ہو گئے مگر بچوں کی خاطر انھوں نے بات کو نہ زیادہ طول دیا اور نہ ہی کوئی اہمیت۔

باہر پھر زوردار دھماکہ ہوا۔ بچے آ کر والدین کی بغل میں دُبک گئے۔ وہ قصداً اپنے سانس کے اتار چڑھاؤ کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ کوئی آواز باہر نہ نکلے۔

جیسے تیسے رات گزر گئی اور دن چڑھ آیا۔ باہر سڑک پر فوجی گاڑیوں کی نقل و حرکت کی آوازیں آنے لگیں۔ سری کنٹھ نے ہمت جٹا کر کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا دیا اور نیچے سڑک پر نظر دوڑائی۔ سونی سڑک پر دور دور تک کہیں کوئی مسافر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ ہجوم نے کل رات پولیس پر جو پتھراؤ کیا تھا اس کی وجہ سے جا بجا پتھر اور ٹوٹی ہوئی اینٹیں بکھری پڑی تھیں۔

سامنے سے پولیس کی ایک گشتی جیپ گزری۔ اس کے اندر سے کوئی شخص گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ اعلان کر رہا تھا کہ شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔

میاں بیوی دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ انھیں ایسا لگا جیسے موت کچھ دیر کے لیے ٹل گئی ہو۔

اس طرح زندگی اور موت کے بیچ سارے خاندان نے تین دن اور تین راتیں گزار لیں۔ تینوں دن کرفیو مسلسل چوبیس گھنٹے جاری رہا۔ کرفیو کے دوران حفاظتی فوج کے دستے سڑکوں پر گشت لگاتے رہے۔ سودا سلف لانے کے لیے بھی ڈھیل نہیں دی گئی۔ سبھی لوگ اپنے اپنے مکانوں میں قید تھے۔

سری کنٹھ چاہتا تھا کہ کرفیو اسی طرح جاری رہے۔ اور تا قیامت جاری رہے۔ اسے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرنا منظور تھا مگر اپنی معصوم بچیوں کی بے حرمتی دیکھنا گوارا نہ تھا۔

تین دن کے بعد ایک گھنٹے کی ڈھیل کا اعلان ہوا۔ لوگ بازاروں میں ایسے نکل آئے جیسے قیدی جیل سے چھوٹے ہوں۔ وقفہ کم تھا۔ اس لیے سبھی دوڑتے بھاگتے نظر آ رہے تھے۔

اس موقعہ کو غنیمت جان کر شیورانی نے ہمت بٹوری اور مکان کے صدر دروازے تک پہنچ گئی۔ حفاظتی دستے کے کئی افراد مستعدی کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں رائفل لیے ہوئے کھڑے تھے۔اس نے عاجزی وانکساری سے ایک سپاہی کو آواز دی۔ ''سنو بھیا، یہ ڈھیل کب تک رہے گی؟''

''بس ایک گھنٹے۔'' گرانڈیل سیاہ فام سپاہی نے اپنی موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کرخت لہجے میں جواب دیا۔

''بھیا، آپ ہماری مدد کر سکو گے۔'' شیورانی انکساری سے پھر بولی۔

سپاہی نے اس خوبصورت عورت کی لاچاری اور بے بسی کو دیکھ کر اپنے لہجے میں نرمی لائی۔ ''ہاں کیوں نہیں۔کہو کیا بات ہے۔'' اس کی نظریں گورے مرمریں بدن کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''بھیا، ہمیں جموں جانا ہے۔کسی ٹرک یا گاڑی کا انتظام کروادو۔ہم عمر بھر آپ کے آبھاری رہیں گے۔دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔نہیں تو وہ مر جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔''

سینکڑوں گاڑیاں اور ٹرک بھاگتے ہوئے لوگوں کو ڈھو رہے تھے۔ ہر جگہ وطن ترک کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ٹکٹ یا ریٹ کے بارے میں کوئی سوال بھی نہ پوچھتا تھا۔جس کو جو چیز مل جاتی اسی میں کود پڑتا۔

سپاہی نے وائرلیس پر نہ جانے کس سے بات کر لی۔مڑ کر دیکھا عورت غائب تھی۔وہ اپنا سامان اور کنبہ لانے کے لیے جا چکی تھی۔ پندرہ منٹ کے بعد صدر دروازے کے سامنے ایک ٹرک رکا جس میں پہلے ہی سے لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔

سری کنٹھ اور اس کے بال بچے تین دن کی قید و بند کے بعد باہر نکل آئے اور سیدھے ٹرک کی طرف دوڑتے چلے گئے۔شیورانی نے جلدی سے صدر دروازے پر تالا لگایا اور وہ بھی ٹرک کی طرف دوڑتی چلی گئی۔

ٹرک پر چڑھنے سے پہلے اس کے دل میں یکا یک ایک کوندا سا لپکا۔ اسے وہ سفید کراس دیکھنے کا اشتیاق ہوا جو ملی ٹنٹوں نے صدر دروازے پر بنایا تھا۔ وہ مڑی اور پھر صدر دروازے کی طرف لپکی۔ اس نے سفید نشان کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ تین دن کے بعد اسے اب یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ نشان دروازے کی کس طرف بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے دماغ پر بہت زور ڈالنے لگی مگر کچھ بھی یاد نہیں آرہا تھا۔ اسے کہیں کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ اس نے ایک بار پھر دروازے پر اوپر سے نیچے تک نگاہ دوڑائی۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ سفید کراس اور نہ ہی اس کا کوئی نشان۔ شیورانی حیران تھی کہ وہ کراس، جو اس نے تین روز پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، کہاں چلا گیا۔ کیا وہ نشان اس کے دل کا وہم تھا یا کوئی خواب....؟ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا۔

پلٹ کر وہ بوجھل قدموں سے ٹرک کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس کے شوہر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ٹرک پر چڑھا دیا اور پھر ٹرک ڈیزل کا کالا دھواں چھوڑتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

لمبی لمبی مونچھوں والا، کالا بھجنگ سپاہی شیورانی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اس کی نظریں بدستور شیورانی کے ملائم گدرائے ہوئے بدن پر پھسل پھسل رہی تھیں۔

شیورانی بھی تشکر آمیز نگاہوں سے اسے تب تک دیکھتی رہی جب تک وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

آؤ کچھ اور لکھیں

''پر لکھوں کیا......؟''

''تم جو لکھو گے یہ ضروری نہیں کہ وہ شائع ہوگا اور جو شائع ہوگا وہ ضروری نہیں کہ تم لکھ سکو گے۔''ضمیر کے درون نے ملامت کی۔

''لکھنا تو میری زندگی کا مقصد بن چکا ہے۔میں اس کے بغیر ایک پل بھی جی نہیں سکتا۔''

''جینا تو خیر تم کو پڑے گا ہی جب تک تمھاری سانسیں باقی ہیں۔اس پر تمھارا کوئی ادھیکار نہیں۔رہی بات لکھنے کی۔تم کیا لکھو گے اور کیا نہیں لکھو گے۔وہ تم سے زیادہ قارئین اور میڈیا پر منحصر ہے۔قارئین جو چاہیں گے پڑھیں گے۔دنیا بھر میں روزانہ ہزاروں لاکھوں پرنٹنگ پریس کروڑوں ٹن مواد اگلتے رہتے ہیں۔قارئین کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ وہ یہ سب کچھ پڑھ سکیں۔ان کو اپنی دلچسپی کا مواد چھانٹنا پڑتا ہے۔وہ حد سے زیادہ انتخابی ہو چکے ہیں۔''

''اور میڈیا......؟''

''میڈیا.......!وہ تو اپنے سرمایہ دار مالکوں اور جذباتی قارئین کے زرخرید غلام ہیں خصوصاً اول الذکر کے۔وہ جو چاہیں گے،شائع ہوگا اور جو نہ چاہیں گے،شائع نہیں ہوگا۔ہاں اس کھیل میں ایک اور اہم کھلاڑی ہے جس کو میں بھول ہی گیا اور وہ ہے حکومت۔''

''حکومت.....!اس کا کیا کام؟''

''کیوں گھبرا گئے۔سچ پوچھو تو ملک کے بیشتر اخبارات اور رسالے حکومت کی امداد ہی سے چلتے ہیں۔حکومت اگر اشتہارات بانٹنا بند کردے تو ان سبھی اخبارات اور رسائل کے دفتروں پر تالے پڑ جائیں گے۔اور پھر سینسر (Censor) کی قینچی بھی تو ہے۔''

''میں یہ مانتا ہوں کہ ان سب اراکین کی خوشنودی کو مدنظر رکھ کر ہی آج کا قلمکار اپنا قلم اٹھاتا ہے مگر اس بات سے انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ ان سب سے اعلیٰ وارفع قاری ہے اور قارئین کا کوئی گروہ نہیں ہوتا۔ ہر قاری کی اپنی مخصوص انفرادی پسند ہوتی ہے۔ اپنی الگ سوچ وفکر ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ لکھنے والے کے نظریے سے اتفاق کرے۔''

''ہا... ہا..... ہا...'' غیبی قہقہے نے ضمیر کو جھنجھلا دیا۔ حیران و پریشان وہ اپنے آپ کو ٹٹولتا رہا۔'' ضمیر، تم شاید اس بات کو بھول رہے ہو کہ قاری قاری نہیں بلکہ ایک مٹی کا ڈھیلا ہے جو محد سے لحد تک کسی نہ کسی کمہار کی گرفت میں جکڑا رہتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے تو ماں باپ اس کو اپنے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ نام مذہب، سکونت، لباس اور سماجی قدریں چننے میں اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسکول میں اساتذہ اس کو اپنے شکنجے میں کستے ہیں۔ پھر پرستش گاہوں میں مبلغ، سیاسی زندگی میں سیاست دان، پیشہ ورانہ زندگی میں باس اور یونین لیڈر اور رہی سہی کسر نکالتے ہیں ذرائع ابلاغ......یعنی ہر موڑ پر کمہار ہی کمہار جو اس مٹی کے ڈھیلے کو اپنی منشا کے مطابق ڈھالتے ہیں۔

''تمھارا مطلب یہ ہے کہ ہم سب پروگرامڈ (Programmed) ہیں۔ بے بس ہیں۔ لاچار ہیں۔''

''یوں ہی سمجھ لو۔ ہم تو محض بھیڑ بکریاں ہیں جنھیں چارے کا لالچ دے کر گڈریے ذبح خانہ تک پہنچا دیتے ہیں۔''

''لالچ......وہ کیسے....؟''

''کسی کو روزی روٹی کی لالچ اور کسی کو جنت کی۔''

''کیا کوئی بھی قاری ایسا نہیں جو آزاد خیال ہو۔ جس کا فکر و عمل اپنا ہو۔ دوسروں سے مستعار نہ لیا ہو۔''

''ایسے چند سرپھرے لوگ ضرور ہیں جو اپنے پاؤں کی بیڑیاں کاٹنے میں کامیاب ہوتے ہیں

مگران جانبازوں تک تمھاری رسائی مشکل ہے۔ وہ تمھاری بات نہیں سن سکتے۔ وہ یا تو زندانوں میں مقید ہیں یا پھر پاگل خانوں میں اپنا سر پٹکتے رہتے ہیں۔

ضمیر اپنے درون کی جرح سن کر مایوس ہوا۔ اس کے بوجھل قدم ریڈیو اسٹیشن کی جانب آہستگی سے اٹھ رہے تھے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر بے برگ سفیدوں کے لانبے لانبے درخت موسم سرما کی برفیلی ہواؤں سے جوجھ رہے تھے۔ درختوں سے پرے کھیتوں کی قطاروں پر ویرانیوں نے ڈیرا ڈال دیا تھا۔ گرم ٹویڈ کے پھرن (چوغے) میں دہکتی ہوئی کانگڑی (چلتی پھرتی انگیٹھی) دبائے ضمیر خراماں خراماں چلا جا رہا تھا۔ چالیس سال پہلے اس کے جرنلسٹ باپ نے مہاراجہ کے رسالداروں کے جوتوں کی تاب نہ لا کر اسی سڑک پر دم توڑ دیا تھا۔ ضمیر نے اپنی ماں اور دو بہنوں کے ساتھ جوار اور باجرے کی سوکھی روٹیاں کھا کر نوید آزادی کا بے صبری سے انتظار کیا تھا۔ اُسی آزادی کا جس کے لیے اس کے نڈر باپ نے اپنی جان کی قربانی دی تھی۔ طلوعِ آزادی کا حشر دیکھ کر اس نے بھی اپنے والد مرحوم کے نقشِ قدم پر چلنے کی ٹھان لی۔ انقلاب کا پرچم ہاتھ میں اٹھایا لیکن قدم قدم پر اپنے آپ کو بیڑیوں میں جکڑا ہوا پایا۔

ضمیر کی منزل ریڈیو اسٹیشن تھی۔ اس کے دوست کرامت علی نے، جو یووانی سروس میں پروڈیوسر تھا، اس کو پروگرام کی ریکارڈنگ کے لیے بلایا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ضمیر کی نگاہیں دو خوبرو نوآموز تخلیق کاروں پر پڑیں جو پروڈیوسر کے روبرو بیٹھی تھیں۔ کرامت علی تقریباً ایک گھنٹے سے ان کے مسودوں کی اصلاح میں جٹا ہوا تھا۔ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ان مضامین کو از سر نو لکھ رہا تھا۔

نسرین اور شمیم دو بہنیں تھیں جو اپنے والد مرحوم کی قربانیوں کا معاوضہ اب قوم سے وصول کر رہی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو مصنف سمجھ بیٹھی تھیں جبکہ ان کی شخصیت میں ماسوا بی اے تھرڈ ڈویژن کے اور کوئی بھی تخلیقی پہلو نظر نہیں آ رہا تھا۔ ضمیر کو دیکھتے ہی کرامت علی کی جان میں جان آ گئی۔ اغلاط کی

کثرت سے وہ تنگ آچکا تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا۔اس نے مسودہ سامنے رکھ کر ایک شریر مسکراہٹ کے ساتھ ضمیر کا خیر مقدم کیا۔

''کہاں رہے تم اتنی دیر؟ کب سے انتظار کر رہا ہوں۔خیر پہلے ذرا اس مسودے کو دیکھ لو۔''

کرامت علی کی آنکھوں میں مچلتی شرارت کو ضمیر بھانپ گیا۔وہ مسودے کی نظر ثانی میں فوراً جُٹ گیا۔خود کرامت چین کی انگڑائی لے کر نسرین اور شمیم کے ساتھ محو گفتگو ہو گیا۔کینٹین سے چائے منگوائی گئی۔نسرین اور شمیم کی موجودگی میں کرامت من ہی من میں دعا کر رہا تھا کہ اس وقت کمرے میں اور کوئی شخص وارد نہ ہو۔ضمیر کی بات اور تھی۔وہ تو اس کا لنگوٹیا یار تھا۔

''ان کی بکنگ کب کی ہے بھائی؟''ضمیر نے چائے پیتے ہوئے سوال کیا۔

''آج ہی....دن کے بارہ بجے۔تبھی تو اتنی جلدی پڑی ہے۔''کرامت نے جواب دیا۔

''یہ تو سارا مضمون ہی نئے سرے سے لکھنا پڑے گا۔ضمیر نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''تو لکھ دو نا یار۔دیکھو کتنی محنت کی ہے ان بے چاری لڑکیوں نے۔کیسے بلند خیالات ہیں۔ہمیں ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔''اس بار کرامت نے بولتے وقت ضمیر سے اپنی نظریں ملانے سے اجتناب کیا۔اس کو خدشہ تھا کہ کہیں اس کی مبالغہ آمیزی اس کے چہرے سے عیاں نہ ہو۔دراصل ان مسودوں سے دوشیزاؤں کا پسینہ نہیں بلکہ ان کا حسن جھلک رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے ایک کرخت مردانہ آواز کرامت علی کی کانوں سے ٹکرائی۔''مے آئی کم ان سر۔''

چائے کی پیالی کرامت کے ہونٹوں سے چپک کر رہ گئی۔اس کا دل چاہتا تھا کہ یوں جواب دے۔''نو یو کین ناٹ''مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ پایا۔اجنبی جواب کا انتظار کیے بغیر ہی کمرے کے اندر داخل ہوا۔

''یس، وہاٹ ڈو یو وانٹ....؟''کرامت کے چہرے پر خفگی صاف نظر آ رہی تھی۔

''سر، میرا نام ہے سرفراز خان۔ باانڈی پور سے آیا ہوں۔ چند روز پہلے' آپ کے خطوط'
پروگرام میں آپ نے مجھے اپنی تخلیقات لے کر ریڈیو اسٹیشن آنے کی صلاح دی تھی۔ سو میں افسانہ لے
کر حاضر ہوا ہوں۔'' پٹو کا کمبل اوڑھے اور سر پر کنٹوپ لگائے سرفراز اتنی مسافت طے کرنے کے
سبب سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اس کی میلی کچیلی قمیض اور مفلر سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اس نے کئی
دنوں سے نہایا نہیں تھا۔ نہاتا بھی کیسے؟ کئی روز سے پارہ درجۂ انجماد کے نیچے اٹکا ہوا تھا اور پھر غربت
کی وجہ سے پانی گرم کرنے کے لیے ایندھن کا پیسہ کہاں سے آتا۔

دونوں لڑکیاں سرفراز کے لال افغانی چہرے، لمبی یہودی ناک، نیلی مست آنکھوں اور مضبوط
مردانہ جبڑوں کا بار بار جائزہ لے رہی تھیں حالانکہ ساتھ ہی وہ اس کی حالت زار کو دیکھ کر اس پر ترس
بھی کھا رہی تھیں۔

''یہ بھی کوئی وقت ہے آنے کا۔ پہلے اپوئنٹمنٹ لینا چاہیے تھا۔ ہم لوگوں کے پاس اتنا وقت
کہاں ہوتا ہے۔'' کرامت علی سنجیدگی سے سرفراز کی طرف مخاطب ہوا۔

''سر، بانڈی پور سے آیا ہوں، اتنی دور سے کیسے اپوئنٹمنٹ لے سکتا تھا۔''

''اچھا بولو کیا چاہیے تمھیں؟''

''سر.... میرا افسانہ.....!'' سرفراز نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا مسودہ کرامت علی کے
سامنے رکھ دیا۔ امید و بیم کے باعث اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ آگے کچھ بھی نہیں بول پایا۔

''کس زبان میں لکھا ہے؟ اردو یا کشمیری؟'' کرامت علی نے استفسار کیا۔

''سر، اردو میں....''

''یہی تو مصیبت ہے تم لوگوں میں۔ ارے بھئی تم کشمیری ہو۔ کشمیری میں لکھا کرو۔ اردو تمھاری
مادری زبان نہیں ہے۔ تم لوگ صحیح اردو نہیں لکھ پاتے۔'' کرامت علی نے اپنا فیصلہ سنایا۔ وہ بھول ہی
گیا کہ خود وہ بھی کشمیری نژاد ہے۔ کرامت کے اس رویہ سے ضمیر بے چین ہوا۔ اسے بچپن کے وہ دن

یاد آئے جب امتحان ہال میں کرامت اسے بار بار سوالوں کے جوابات پوچھتا تھا۔ یہ بات الگ کہ اثر ورسوخ کی وجہ سے کرامت اب اس کرسی پر براجمان تھا۔ سرفراز کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ضمیر کو ترس آیا۔ اس کے جی میں آئی کہ کرامت سے پوچھ لے کہ اردو پروگرام پیش کرنے کے لیے تمھارے پاس کس اہلیت کی سند ہے۔ آخر تم بھی تو کشمیری ہو۔ آغا حشر، دیا شنکر نسیم، علامہ اقبال، رتن ناتھ سرشار، برج نارائن چکبستؔ، برج موہن دتاتریہ کیفی، سدرشن، قدرت اللہ شہاب، آنند نرائن مّلا، اور سعادت حسن منٹو۔ وہ بھی تو کشمیری تھے۔ اردو لٹریچر پر تو ان کی اِمٹ چھاپ ہے۔ مگر اس نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔

سرفراز خاموش سر جھکائے اپنے مسودے پر آنکھیں جمائے کھڑا رہا۔ وہ منتظر تھا کہ کب پرڈیوسر صاحب اس کے مسودے کو کھول کر پڑھ لے گا۔ ''اگر وہ منظور نہیں کرتا، نہ کرے، کم سے کم پڑھ تو لے۔'' یہ اس کے دل کی آواز تھی۔

کرامت نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ مسودے کو چھوا تک نہیں۔ البتہ ایک اور سوال کر بیٹھا۔ ''جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات اور پس ساختیات کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ ان تحریکوں نے ہمارے اردو افسانے پر کیا اثرات چھوڑے ہیں۔'' پروڈیوسر صاحب نے خود پوری عمر میں صرف علامتوں سے بھرپور پانچ افسانے لکھے تھے جو بہت کم لوگوں کو سمجھ آگئے تھے مگر وہ ان پر ہمیشہ اتراتا رہتا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ سرفراز ادبی تحریکوں سے ناواقف تھا مگر وہ اس وقت ایسے سوالوں کے جواب دینے کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ وہ صرف اس غرض سے آیا تھا کہ پروڈیوسر صاحب افسانہ پڑھ کر بتا دے کہ اس کا افسانہ نشر ہونے کے قابل ہے یا نہیں ہے۔ وہ نہ تو کسی یونیورسٹی کا داخلہ لینے آیا تھا اور نہ ہی روزگار کے لیے۔ پھر یہ انٹرویو کس لیے؟ اضطراب میں وہ کچھ بھی جواب نہ دے پایا۔

''تم نے سارتر، بیکٹ یا کافکا کا نام سنا ہوگا......؟ ان کے بارے میں کچھ جانکاری دے سکو

گے۔''

سرفراز کے ہونٹ ہی سل چکے تھے۔ایسی ذلت کا سامنا اسے زندگی میں پہلی بار کرنا پڑا تھا۔وہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کرے۔مسودہ اٹھا کر باہر چلا جائے یا پھر وہیں کھڑا رہے۔

''ارے بھئی تم تو بت بنے کھڑے ہو۔میرے سوالوں کا جواب دو گے یا نہیں۔اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔یہ بتاؤ انتظار حسین کی کہانیاں پڑھی ہیں یا نہیں؟''

سرفراز تب بھی خاموش رہا۔تنگ آ کر کرامت علی نے مسودے کو سرفراز کی جانب پھینکتے ہوئے کہا۔''افسانے کی ابجد سے تو واقف نہیں، چلے آتے ہیں افسانہ نگار بننے۔افسانہ کہاں سے کہاں پہنچا ہے۔صفحۂ ادب پر کن نئے رائٹرس نے اپنا لوہا منوایا ہے۔یہ سب تو معلوم نہیں پھر کیا افسانہ لکھا ہوگا تم نے۔ارے بھئی، پہلے افسانے کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کر لو پھر اپنے ہاتھ میں قلم اٹھانے کی کوشش کرو۔'' کرامت علی سر جھکائے بڑبڑا تا رہا جبکہ سرفراز نے اپنا مسودہ یوں اٹھایا جیسے کوئی بھاری بھرکم پتھر اٹھا رہا ہو۔اس کو کیا معلوم تھا کہ اردو افسانے نے ارتقاء کی اتنی ساری منزلیں طے کر لی ہیں اور وہ خود ابھی بھی اندھیروں ہی میں بھٹک رہا ہے۔اس کو پریم چند اور منٹو کے زمانے اور آج کے زمانے میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔اس کے اردگرد آج بھی ہوری اور ایشر سنگھ ہی گھوم رہے تھے۔آئے دن چھپنے والے افسانوں میں بھی کوئی خاص فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔لوگ تو عام فہم افسانوں کو ہی پسند کرتے ہیں جن میں کہانی ہو، اتار چڑھاؤ ہو، اور زندگی کی عکاسی ہو۔پھر یہ پروڈیوسر صاحب کو کون سا بھوت سوار ہو گیا؟ اپنی بےعزتی کا تلخ گھونٹ پیتے ہوئے نوجوان پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔کرامت علی نے اس کے اندر جنمے کہانی کار کا گلا ہمیشہ کے لیے گھونٹ دیا۔

کچھ دیر بعد ضمیر نے مسودوں کی نظر ثانی کر کے کرامت کے سامنے رکھ دیے اور پھر اپنے پروگرام کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔

''یار ضمیر، تمھارا اسکرپٹ تو میں بنا دیکھے ہی منظور کر لیتا ہوں مگر کم سے کم میری نوکری کا خیال

رکھا کرو۔ اپنا مضمون ذرا احتیاط سے لکھا کرو۔'' کرامت نے مشورہ دیا۔

ضمیر کچھ سمجھا نہیں۔ اس لیے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ ''آخر ایسی کیا بات ہوئی کہ تم اتنے خفا ہو گئے۔ میں نے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں لکھی جس سے خدانخواستہ تم پر کوئی آنچ آجاتی۔''

''ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ مگر بھئی تمھیں تو معلوم ہے کہ آج کل ایمرجنسی کا زمانہ ہے۔ ہر طرف سے پہرے بٹھائے جا چکے ہیں۔ کوئی بھی بات جو حکام کے مفاد کے برعکس ہوتی ہے فوراً نوٹ کی جاتی ہے۔ وہ تو شکر کرو کہ تمھاری ریکارڈنگ نشر ہونے سے پہلے میں نے اتفاقاً سن لی ورنہ میری نوکری کب کی چلی گئی ہوتی۔ وہ تم نے جو عورتوں کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی تھی گو وہ سو فیصدی سچ ہے مگر آج کل ایسے خیالات نشر کرنا مناسب نہیں۔ میں نے اسے فوراً ایڈٹ کر لیا۔''

بات آئی گئی ہو گئی۔ نسرین اور شمیم کی ریکارڈنگ ہوئی۔ پھر ضمیر کے پروگرام کی باری آ گئی اور اس کے بعد دونوں سیدھے کافی ہاؤس پہنچ گئے۔ کافی پیتے ہوئے ضمیر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''آخر وہ کون سا مضمون ہے جس پر ایک قلم کار آزادی سے اپنا قلم اٹھا سکتا ہے؟ سیاست.....! وہاں حکومت کی پابندیاں ہیں۔ مذہب.....! وہاں ملاؤں کی پابندیاں ہیں۔ سیکس......! وہاں سماج کی پابندیاں ہیں۔ اگر ہر طرف پابندیاں ہی پابندیاں ہیں تو آئے دن ہزاروں لاکھوں کتابیں کیوں چھپتی ہیں؟ اتنے سارے اخبار اور رسالے کیوں شائع ہوتے ہیں؟ ان میں کیسا مواد چھپتا ہے؟ ان میں بھی تو قلم کار حضرات ہی کی تخلیقات ہوتی ہیں۔''

''ہوتی ہیں۔ بے شک ہوتی ہیں لیکن یہ سب وقتی ادب ہے دائمی نہیں۔ یہ صرفِ اوقات کا ایک آسان طریقہ ہے۔'' اندر سے آواز آئی۔

''پھر میں کیا لکھوں........؟''

''کچھ ایبسٹریکٹ.... کچھ استعارے.... کچھ کنائے..... علامتوں سے بُن کر ایک مکڑی کا جال جو عام فہم نہ ہو۔ جو صرف چند ایک نقادوں کی سمجھ میں آئے جن کے سوچنے کا ڈھنگ تمھارے ساتھ

مطابقت رکھتا ہو مثلاً حکمرانوں کو مہتاب اور جھیل کے پانیوں کو عام رعایا سے تشبیہ دو۔ مہتاب، جو جھیل کے پانی میں جھلملاتا نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جھیل کے پانی کے بیچوں بیچ تیرتا لہروں سے کھیل رہا ہے، خوشیاں بانٹ رہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ جھیل سے کوسوں دور اپنی ہی دنیا میں مست ہوتا ہے۔''

''یہ تو بہت ہی اچھا پلاٹ بن سکتا ہے۔ ضمیر تم اپنے من کی آنکھیں کھول دو۔ ایسے کئی سراب تمھیں نظر آئیں گے۔ تم بس لکھنے کی کوشش کرو۔ صرف اپنے لیے ایک انوکھی تخلیقی دنیا بسا لو۔''

''تخلیق تو ذریعۂ ترسیل ہوتی ہے۔ اگر میرا نقطہ نظر عام لوگوں تک نہیں پہنچ پاتا تو پھر میرے لکھنے کا فائدہ ہی کیا ہے اور یہ جو تمھاری دلیل ہے کہ آرٹسٹ صرف اپنی خوشنودی کے لیے تخلیق کرتا ہے محض فریب ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہی کیوں؟ ان کے تصور ہی سے کیوں نہ جھوم اٹھتا۔ وہ اگر اپنے فکر و فن کا اظہار کرتا ہے تو اس میں ایک ہی مدعا کارفرما ہوتا ہے اور وہ یہ کہ لوگ اس کے فن کو سمجھ لیں اور اس کی کوششوں کو سراہیں۔''

''ضمیر، تم اس بات کی چنتا کیوں کرتے ہو۔ تم اپنے خیالات کو صرف نقادوں پر فوکس کر لو۔ وہ اچھے تبصرے لکھیں گے، زمین و آسمان کے قلابے ملائیں گے۔ تمھاری شہرت چار سو پھیلے گی۔ حکومت کی طرف سے ایوارڈ ملیں گے اور لوگ تمھاری کتابیں خریدنے کے لیے بے تاب ہوں گے۔''

''ہاں تم سچ کہتے ہو۔ میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔'' ضمیر کے دماغ میں ہلچل سی مچی۔ وہ خود سوال کرتا اور خود ہی جواب بھی دیتا۔ اس کی سوچ کا سلسلہ کرامت کی آواز نے توڑ دیا۔

''ضمیر بھائی۔ تمھیں معلوم ہے آج ہمارے آڈیٹوریم میں ایک مباحثہ منعقد ہوا تھا۔ موضوع تھا 'جہیز۔ ایک سماجی بدعت'۔ ہماری ایک اسٹاف ممبر واجدہ تبسم نے بھی اس مباحثے میں شرکت کی۔''

''اس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے؟'' ضمیر گویا ہوا۔

''بات ہے۔تبھی تو کہہ رہا ہوں۔واجدہ نے اس موضوع کے خلاف دلیلیں پیش کیں یعنی جہیز کو جائز ٹھہرایا۔اس کا کہنا ہے کہ ہر اس سوسائٹی میں جہاں لڑکیوں کو ماں باپ کی جائیداد سے برابر کا حصہ نہیں ملتا ہے وہاں اسے جہیز لینے پر اصرار کرنا چاہیے۔''

''سچ.....!''

''ہاں سچ کہہ رہا ہوں۔اسے پہلا انعام بھی ملا کیونکہ اس کے خیالات نہ صرف اچھوتے تھے بلکہ عام روش سے ہٹ کر بھی تھے۔مگر بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ خیالات واجدہ کے اپنے نہیں تھے۔اس نے تمھارا کوئی مضمون جو حال ہی میں 'پولیٹکل ٹائمز' میں چھپا تھا، حرفاً حرفاً پڑھا تھا۔یہ تو سراسر دھوکے بازی ہوئی۔اس کے لیے تمھیں قانونی کارروائی کرنی چاہیے۔''

''کیوں.....!''

''کیونکہ اس نے تمھارے خیالات چرا کر انعام حاصل کیا۔''

''اچھا ہی تو کیا.....کم سے کم میرے خیالات کی تشہیر ہوئی۔اچھے تخلیق کار کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کے خیالات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائیں۔''

''خیالات کی ترسیل کا یہ طریقہ نہایت ہی بھونڈا ہے۔''

''وہ کیوں....؟ آج جب ہم نسرین اور شمیم کے مسودے اصلاح کے بہانے از سر نو لکھ رہے تھے، وہ کیا تھا؟ کیا ہم اپنے خیالات ان مضامین میں نہیں بھر رہے تھے؟ کیا اتنی رد و بدل کے بعد ان کے خیالات کے بجائے وہ مضامین ہمارے خیالات کی عکاسی نہیں کر رہے تھے؟ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے لیے ہم اپنی رضامندی سے اپنے خیالات پیش کر رہے تھے جبکہ واجدہ نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی میرے افکار چرا لیے۔کرامت بھائی، سچ پوچھو آج نوے فیصدی ادب میں سرقہ ہوتا ہے۔ دوسرے ادیبوں کے خیالات چوری کیے جاتے ہیں۔اچھے اور برے قلم کاروں میں اب فرق صرف اس بات کا رہ گیا ہے کہ اچھا قلم کار بڑی نفاست سے دوسروں کے خیالات چرا کر اپنا لیتا ہے اور بڑی

خوبی سے قارئین کو پروستا ہے جبکہ بُرا قلم کار نہ تو فکر کے ساتھ اور نہ ہی فن کے ساتھ انصاف کر پاتا ہے۔''

''ضمیر تم تو بس ....!'' کرامت علی نے جملہ ادھورا چھوڑنا ہی مناسب سمجھا۔ پھر اپنی گھڑی کو دیکھ کر تلملایا۔ گھڑی سے نظریں ہٹالیں تو سامنے ویٹر کھڑا ضمیر سے تقاضا کر رہا تھا۔

ضمیر نے بل دیکھا۔ اپنی ساری جیبیں ٹٹولیں اور سبھی روپے پیسے نکال کر انھیں گننے لگا۔ خدا کا شکر تھا کہ بل کے برابر رقم برآمد ہوئی۔

ویٹر اپنا ٹِپ پانے کے لیے ضمیر کو دیکھتا رہا۔ ضمیر نے ایک بار پھر اپنی جیبیں ٹٹولیں مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ویٹر سمجھ گیا۔ ضمیر کھسیانا ہو کر ویٹر کے چہرے کو ایسے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ'' آج معاف کر دو، بھائی۔''

ویٹر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی وہ ضمیر سے مخاطب ہوا۔'' صاحب، آپ پریشاں نہ ہوں۔ پھر کسی روز سہی جب دے دینا۔''

☆☆☆☆☆
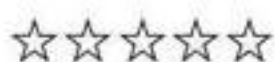
پارٹی

اقوام متحدہ ترقیاتی پروگرام کے تحت پچھلے سال ایک سیمینار پیرس میں منعقد ہوا۔ اس سیمینار میں حصہ لینے کے لیے دنیا کے کونے کونے سے ڈیلی گیٹ آچکے تھے۔ موضوع تھا 'اکیسویں صدی اور اقتصادی ترقی'۔

اِدھر ملینیم تھک ہار کر دم توڑ رہا تھا اور اُدھر کانفرنس ہال میں لمبی لمبی تقریریں ہو رہی تھیں۔ گلوبلائزیشن، لبرلائزیشن، نیا عالمی تجارتی نظام۔ نام بڑے اور درشن چھوٹے۔ دنیا سے غریبی، بھوک مری، جہالت اور نابرابری کو نیست و نابود کرنے کی قراردادیں پاس کی جا رہی تھیں۔

یہ الفاظ سن کر غریب پسماندہ ممالک کے ڈیلی گیٹ شیر خوار بچوں کی طرح ہمک رہے تھے۔ اور اپنی نشستوں پر بیٹھ کر حسین خوابوں کے تانے بانے بُن رہے تھے۔

کھوکھلے الفاظ........ حسین خواب....... ہمکتے لوگ........!

رات میں ڈنر کا انتظام ہوٹل ہولِڈے اِن کے بینکوئٹ ہال میں کیا جا چکا تھا۔ ہال میں بہت بھیڑ تھی۔ سبھی چہرے ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس سے بات کریں اور کس سے نہیں۔ پھر آپس میں بات کرنے کے لیے باہم دلچسپی کا موضوع بھی تو ہونا چاہیے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ دنیا کے معزز ترین انٹیلکچول ایک جگہ جمع ہوں اور آپس میں بات کرنے کے لیے لاشعوری طور پر موضوع ڈھونڈ رہے ہوں۔

میں نے جی میں ٹھانی کہ گوشہ نشین ہو کر وہسکی کا مزہ لے لوں۔ بس ایک یا دو گھنٹے کا ہی تو سوال ہے۔ جیسے تیسے کٹ جائیں گے۔

دنیا کے بکھیڑوں سے بھاگنے کی آپ کتنی بھی کوشش کیجیے پھر بھی یہ دنیا آپ کو کونوں کھدروں

سے ڈھونڈ نکالے گی۔ اکیلے تنہائی میں دم بھر بھی گزارنے کی مہلت نہ دے گی۔ بڑی بے مروت ہے یہ دنیا۔

اپنے آپ میں گم ہونے کی خاطر میں نے اپنا جام بھر لیا اور سیدھے ایک نیم تاریک گوشے میں پناہ لی مگر یہاں بھی خلوت میسر نہ ہوئی۔ چند ہی لمحوں میں ایک جاپانی نمائندے سے آنکھیں چار ہو گئیں۔

اس نے اخلاقاً کورنش بجالائی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں 'ہیلو' کہہ دیا۔

میں نے بھی جواب میں سر ہلا کر 'ہیلو' کہہ دیا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بات کرنے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن وہ انگریزی بہت کم سمجھتا تھا اور مجھے جاپانی کا کوئی علم نہ تھا۔ انگریزی ہماری مجبوری تھی۔ بس کچھ دیر ہم دونوں ایک دوسرے کو اشاروں کنایوں سے سمجھنے کی کوشش کرتے رہے اور کبھی کبھار 'ہوں، ہاں' کرتے رہے۔

کہاں تو ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیا ایک عالمی گاؤں بن چکا ہے اور کہاں ایک دوسرے کی زبان سمجھنے سے قاصر ہیں۔ غیر ممالک کی بات تو الگ، خود اپنے ملک میں ایک ریاست کا باشندہ دوسری ریاست کے باشندے کو نہیں سمجھ پاتا۔ پھر بھی عالمی گاؤں بسانے کے اتنے لمبے چوڑے دعوے.....!

میں ہنس دیا اور پھر سے اپنی مونچھوں کو شراب میں ڈبونے لگا۔

جاپان کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں ہے۔ بس تھوڑا بہت جو علم ہے وہ ٹی وی اور ناولوں کے ذریعے حاصل ہو چکا ہے۔ مثال کے طور پر میں نے ایک دل سوز ٹی وی سیریل دیکھا تھا جس کا نام غالباً 'اوشین' تھا۔ ایک امیر بوڑھی عورت مڑ کر اپنی یادوں کے زخم کرید رہی تھی۔ سیریل دیکھنے سے پہلے مجھے یہ گماں تھا کہ جاپان صرف موم کی گڑیاؤں، آسمان سے چھوتے ہوئے اسکائی سکریپروں اور تیز رفتار ہونڈا موٹر گاڑیوں کے لیے مشہور ہے۔ اس دن مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہاں کے گاؤں میں بھی غریب لوگ رہتے ہیں جو پائی پائی کے لیے محتاج ہوتے ہیں۔ سودخوروں

کے استحصال کی وجہ سے کمسن 'اوشین' جیسی لڑکیوں کو پیشہ کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔افسوس اس بات کا ہے کہ اپنے یہاں اسکولوں میں زیادہ تر انگریزی،فرانسیسی، پرتگالی اور سکینڈ نیویائی قوموں کے بارے میں پڑھایا جاتا ہے۔وہاں کے سمندری لٹیروں نے دنیا کو کس طرح اپنے قبضے میں کرلیا یا پھر نشاۃ الثانیہ اور صنعتی انقلاب نے کیسے انسانی تہذیب کو اپنی جکڑ میں لے لیا۔اب صورت حال یہ ہے کہ دنیا بس امریکا اور یوروپی ممالک تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔جاپان کے بارے میں تب ہی جانکاری حاصل ہوتی ہے جب ہیروشما یا ناگاساکی کا ذکر ہوتا ہے ورنہ جاپان کو کون پوچھتا ہے۔ہیروشما اور ناگاساکی کے بغیر جاپان کا چرچا ادھورا سا لگتا ہے۔دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر ان دو جگہوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

میرا دل چاہتا تھا کہ جاپانی ڈیلی گیٹ سے ہیروشما اور ناگاساکی کے بارے میں جانکاری حاصل کروں۔اسے پوچھوں کہ اب وہاں کا کیا حال ہے؟ کیا لوگ وہاں پر معمول کی زندگی بسر کرتے ہیں؟ کیا نیوکلیائی دھماکوں سے معذور ہوئے لوگوں میں کوئی جسمانی یا نفسیاتی کمزوری پیدا ہوئی ہے؟ کیا اب بھی انھیں ڈراؤنے خواب ستاتے ہیں؟ لیکن وہ میری بات سمجھے تب نا۔مجھے لگا کہ اسے پہلو بچانے میں ہی اپنی خیریت ہے۔جام بھرنے کے بہانے میں نے اس سے رخصت لی اور پھر اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

وہسکی کی چسکیاں لیتا ہوا میں ایک امریکی ڈیلی گیٹ کے ساتھ جونک کی طرح چپک گیا۔ امریکیوں سے گفتگو کرنے کا مزہ ہی الگ ہوتا ہے۔دل میں افتخار کا احساس سا پیدا ہوتا ہے مانو کسی فوق البشر کے ساتھ باتیں کر رہے ہوں۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دونوں انگریزی بولتے ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں۔البتہ گفتگو کے لیے کوئی مشترک موضوع نہیں مل رہا تھا۔دراصل امریکیوں اور ہندوستانیوں کے بیچ ایسے بہت کم موضوع ہیں جن میں دونوں کو باہم دلچسپی ہو۔وہ آسمان کی باتیں کرتے ہیں اور ہم زمین کی۔وہ سرمایہ داری کے گُن گاتے ہیں اور ہم سوشلزم کے۔وہ

اسٹاروارز کی باتیں کرتے ہیں اور ہم گیہوں چاول کی ۔ وہ میزائیلوں اور سائنسدانوں کی باتیں کرتے ہیں اور ہم سانپوں اور سپیروں کی ۔

اس کی نگاہیں چاروں جانب ایسے گھوم رہی تھیں جیسے وہ کہیں کوئی پناہ ڈھونڈ رہا ہو۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔ خدا کا شکر کہ ایک آسٹریلیائی ڈیلی گیٹ نے میری مشکل حل کردی ۔ وہ ہماری طرف خود بخود کھنچا ہوا چلا آیا۔ میری طرف کم اور امریکی نمائندے کی طرف زیادہ۔ اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے ایسے محو گفتگو ہوئے کہ انھیں میرے وہاں سے غائب ہونے کا پتہ بھی نہ چلا۔ میری آنکھیں باز کی مانند بدستور اچھی رفاقت کی جستجو میں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں ۔ دریں اثنا بھیڑ میں سے ایک مانوس سا چہرہ ابھر آیا۔ دل کہہ رہا تھا کہ ہو نہ ہو یہ ضرور ہندوستان سے آیا ہوگا۔ وضع قطع سے بالکل اپنا سا لگ رہا تھا۔ اگر مجھے اپنی ٹیم کے ممبران کا علم نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ میں اس کو اپنی ہی ٹیم کا رکن سمجھ لیتا۔

''آداب عرض ہے'' قریب جا کر میں نے اس کی توجہ چاہی۔

''آداب'' اس نے جواب دیا

''میرا نام تارا چند ہے۔ چنڈی گڑھ کا رہنے والا ہوں۔''

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے اسحٰق خان کہتے ہیں۔ کراچی کا رہنے والا ہوں''

عجیب اتفاق تھا کہ دونوں نے اپنے آبائی شہروں کا نام تو لیا مگر اپنے ملک کا نام بتانے کی ضرورت نہ سمجھی۔

تواریخ کا وہ منحوس لمحہ تھا جب ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ کردیے گئے تھے۔ تب سے سیاست دانوں نے حتی الامکان کوششیں کیں کہ دونوں قوموں کی الگ الگ شناخت قائم ہوسکے۔ ہسٹری ازسرنو لکھی گئی۔ ڈریس کوڈ بنائے گئے ۔ مذہب کا ملمع چڑھا کر ثقافت کا بلاتکار کیا گیا مگر پھر بھی آج تک وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ وہ ہم سے ہمارا مشترکہ ورثہ چھین نہ پائے ۔ آج بھی دو قوموں میں

زیادہ کچھ فرق دکھائی نہیں دیتا۔

''ارے صاحب، کب سے آپ کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک جوکر ملے۔ یونو وہاٹ آئی مین۔(You know what I mean)۔ یہ انگریز لوگ۔ان کے ساتھ تو ہمارا کوئی میل ہی نہیں بنتا۔آپ مل گئے تو آگے اچھا ٹائم کٹے گا۔'' برصغیر کے لوگ سب گوری چمڑی والوں کو'انگریز' کہتے ہیں چاہے وہ پولینڈ کے ہوں یا جرمنی کے، آسٹریلیا کے ہوں یا ڈینمارک کے۔

''ہاں ضرور کیوں نہیں۔سنایئے آپ کے وہاں آجکل کیا ہو رہا ہے؟''

''ارے صاحب ہونا کیا ہے خاک....اور وہ بھی ترقی پذیر ملک میں۔ایک پارٹی آتی ہے، وعدے کرتی ہے، ستہ سنبھالتی ہے اور دو دو ہاتھوں سے لوٹتی ہے۔پھر دوسری پارٹی آتی ہے، وہ بھی نئے وعدے کرتی ہے، حکومت سنبھالتی ہے اور پہلے والوں سے زیادہ لوٹ مچاتی ہے۔ہاں بیچ بیچ میں نوحؑ کا سیلاب آتا ہے۔معاشرے کی تطہیر کے واسطے فوجی حکومتیں آتی ہیں جو چند ایک سال راحت تو دلاتی ہیں مگر بعد میں طاقت ان کے سر چڑھ کر بولتی ہے اور وہ سِول گورنمنٹ سے بھی زیادہ بدعنوانیوں میں ملوث ہو جاتی ہے۔

''سچ مانئے ہمارے ہاں بھی صورتحال کچھ ایسی ہی ہے۔رتی بھر بھی فرق نہیں۔ادھر حکومت سنبھالی، اُدھر سوئس بنک میں کھاتا کھلوایا۔البتہ ہم نے فوجی حکومتیں نہیں دیکھیں۔''

''خدا ان سے محفوظ رکھے۔ بڑی کُتی چیز ہیں۔دو ملکوں کے درمیان تناؤ رہے تو ان کی پانچوں انگلیاں گھی میں رہتی ہیں۔''

''کل تک دونوں ممالک ایک ہی تھے اور آج.....آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے ہیں۔''

''آپ سچ کہتے ہیں۔''

''ہم دونوں ایک ہی مشترکہ گنگا جمنی کلچر کی پیداوار ہیں۔ایک طرح کا رہن سہن،لباس،زبان، ثقافت اور تہذیب......سب کچھ ملتا جلتا ہے۔''

''میرا بھی یہی ماننا ہے۔بس ایک مصنوعی فصیل کھڑی کر دی گئی ہمارے بیچ میں۔''

اتنی دیر میں بھیڑ میں سے ایک چہرہ ابھر کر ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا۔''آپ انڈین ہیں..!'' چہرے مہرے سے ہندوستانی لگ رہا تھا۔

''جی میں ہندوستان سے آیا ہوں۔''میں نے جواب دیا۔

''میں....میں پاکستان کا رہنے والا ہوں۔''پاکستانی نمائندے نے بھی اپنا تعارف پیش کیا۔

''میں امبر سردار ہن والا ہن۔اتھے اقوام متحدہ دے آفس وچ کام کردا ہن۔دس سالاں توں پیرس وچ رہنداایاں۔''اجنبی نے بھی اپنا تعارف کرایا۔

''آپ نے فرمایا تھا کہ آپ خاص کراچی کے رہنے والے ہیں۔''میں نے پاکستانی نمائندے سے جان بوجھ کر بات کی تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ دو ہندوستانی مل گئے اور مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔

''وہ تو اب کی بات ہے۔ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ وہ آگرہ کے رہنے والے تھے۔اس شہر کی جب وہ باتیں چھیڑتے ہیں ان پر ناستلجیا طاری ہو جاتا ہے۔میں نے آگرہ نہیں دیکھا ہے۔پتہ نہیں تاج محل کیسا ہوگا۔کیا آپ کبھی وہاں گئے ہیں؟''

''ہم بھی دراصل امبالہ کے رہنے والے ہیں۔پتا جی گورنمنٹ ملازم تھے۔جب چنڈی گڑھ شہر بسایا گیا ہم بھی وہیں کے ہو کر رہ گئے۔''

دھیرے دھیرے میں اور امرتسری پنجابی ٹھیٹ پنجابی میں گفتگو کرنے لگے۔اپنے دیش سے ہزاروں میل دور اپنی زبان میں بات کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ہماری ہنسی اور قہقہوں کو سن کر آس پاس کے لوگ بھی ہماری طرف متوجہ ہوئے مگر ہم نے انھیں نظرانداز کر کے جام پر جام چڑھائے۔

پاکستانی ڈیلی گیٹ کچھ کٹا ہوا سا محسوس کرنے لگا۔اسے پنجابی بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی۔تھوڑی

دیر ہمارے چہروں کے اُتار چڑھاؤ دیکھتا رہا اور پھر چپکے سے کہیں اور کھسک گیا۔

پارٹی اختتام کو پہنچی۔ امرتسری پنجابی مجھ پر اپنی سخاوتوں کی بارشیں کرتا رہا۔ اس نے میری آفیشل ٹیکسی واپس بھجوادی اور خود ہی اپنی گاڑی میں اس ہوٹل تک لفٹ دی جہاں میری بیوی اور بارہ سال کا بیٹا بے صبری سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ دونوں اس اجنبی شہر میں اکیلے پڑ گئے تھے اور شاید میرے ساتھ کہیں جانے کے لیے اتاؤلے ہو رہے تھے۔

جونہی میری بیوی نے مجھے دیکھا، وہ آپے سے باہر ہوگئی اور ٹھیٹ پنجابی میں گالیاں دینے لگی جنھیں میں یہاں پر نہیں لکھ سکتا۔ میرے میزبان نے موقع کی نزاکت کو سمجھ کر اجازت لے لی اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

میں اپنی فیملی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ میری دنیا سمٹتے سمٹتے کہاں پہنچ گئی تھی۔ جاپانی سے زبان کا مسئلہ درپیش آیا تھا، امریکی سے نظریئے کا، پاکستانی سے سرحد کا اور پھر پنجابی سے نجی معاملات کا۔ اتنے لوگوں کو چھوڑ کر میں آہستہ آہستہ اپنے ہم وطن تک محدود ہو گیا تھا اور اب فیملی کو دیکھ کر اسے بھی الوداع کہنا پڑا۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔

آدمی کیسا بھی ہو، ہمیشہ خود ارتکاز کا پتلا بنا رہتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ کبھی کبھار میرے ساتھ ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں اپنے اسٹڈی کمرے میں بیٹھا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ کمرے میں میری کتابیں ہوتی ہیں یا پھر میں۔ اور کوئی نہیں۔ اس وقت مجھے کسی کی موجودگی اچھی نہیں لگتی ہے۔ بیوی اور بچوں کی بھی نہیں۔ خود غرضی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جس بیوی کے ایک اشارے پر میں سارے کام چھوڑ چھاڑ کر اسے پیار و محبت جتانے لگتا ہوں، اس وقت اسی بیوی کا لمس مجھے گھموریوں کی چبھن جیسا محسوس ہوتا ہے۔ مجھے صرف اپنا وجود بے ضرر معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنے خول کے اندر دھنستا چلا جاتا ہوں۔ اس وقت دنیا کی ہر شئے خلل انگیز لگتی ہے جس سے چھٹکارا پانے کا میں متمنی ہوتا ہوں۔ شاید اسی گھٹن کا دوسرا روپ میرا آج کا یہ فعل بھی تھا۔

مجھے یقین ہوگیا کہ آدمی خودغرض ہے۔اپنی خوشی اور سلامتی کی خاطر بیسا کھیاں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ مجھے اپنی خود پرستی کا بھی احساس ہونے لگا ہے۔اپنے لیے میں خود ہی مخلص دوست ہوں، اچھا ساتھی ہوں اور بہترین سیکورٹی ہوں۔باقی سب مارجنل ویلیو (Marginal value) رکھتے ہیں ۔اور یہی حقیقت بھی ہے۔

''آج آپ کسی گہری سوچ میں پڑے ہوئے ہیں۔کیابات ہے؟'' میری بیوی نے مجھے چونکا دیا۔

''کچھ نہیں،بس یونہی سوچ رہا تھا........''

''میں کب سے آپ کوایک بات کہنے کے لیے بے تاب ہوں۔''

''کہو کیا بات ہے؟''

''آج جب ہم دونوں باہر ٹہل رہے تھے تو ایک نیگرو جوڑے نے بنٹی کو دیکھ کر اسے اپنے پاس بلایا اور بہت پیار کیا۔فرانسیسی زبان میں اس سے باتیں کرنے لگے اور وہ خوش ہوتا رہا جیسے سب کچھ سمجھ رہا ہو۔انھوں نے اسے ڈھیر سارے چاکلیٹ اور کھلونے خرید کر دیے۔ادھیڑ عمر کے تھے۔ ہسبنڈ آرٹسٹ تھا اور بیوی موسیقار۔ بہت ہی مخلص لوگ تھے وہ۔ہم دونوں کو آئیفل ٹاور لے گئے اور پھر لووَر میوزیم بھی دکھایا۔اس کے بعد کشتی میں دریائے سئین کی سیر بھی کروائی۔آپ کو تو کانفرنس سے فرصت ہی نہیں ملتی۔بس کام...کام.....اور کام۔اگر یہاں آکر یہی کرنا تھا تو ہمیں لے کر کیوں آئے۔میں نے سوچا تھا ہمیں پیرس گھومنے کا موقع مل جائے گا۔سیر سپاٹا ہوگا۔یہاں آپ کو فرصت ہی نہیں ملتی۔بھگوان بھلا کرے ان دونوں کا۔کم سے کم ان کی بدولت کچھ جگہیں تو دیکھنے کو ملیں۔نہ جان نہ پہچان، بے چاروں نے بنٹی کا کتنا خیال رکھا۔اپنوں سے تو پرائے ہی بھلے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑ دیا ہو۔ میں پھر فکر و تردّد کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ ہم دونوں، میاں بیوی، ایک ہی جگہ پر قیام کر رہے ہیں اور ایک ہی

ماحول میں رہ رہے ہیں۔ پھر بھی ہم دو متضاد تجربوں سے گزر گئے اور مختلف نتیجوں پر پہنچ گئے۔ ایک طرف میری بیوی تھی جس نے مصنوعی نسلی سرحدوں کو پھلانگ کر ساری دنیا کو گلے لگا لیا اور دوسری طرف میں تھا جو ریشمی کرم کی مانند اپنے گرد کویا بنتا رہا اور پھر اسی میں قید ہوتا گیا۔

☆☆☆☆☆

احتجاج

اس روز میں کار سے سفر کر رہا تھا۔ چنانچہ ڈرائیور کو اس بات کا احساس تھا کہ مجھے کانفرنس میں دیر ہو رہی ہے وہ بہت تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ دن کی شروعات ہی بدشگونی سے ہوئی۔ صبح ہی سے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ایک طرف بیوی کی فرمائشیں اور دوسری طرف بچوں کی مانگیں۔ دو چار روز پہلے بیوی نے گھریلو کاموں کی لسٹ تھما دی تھی اور آج ہی حساب مانگنے لگی۔ بچوں کے فیس کی آخری تاریخ بھی آج ہی مقرر تھی اور پھر وہ ملونی کا یونیفارم بھی پھٹ چکا تھا۔ ادھر نوکرانی کا شوہر پیلیا کے باعث اسپتال میں بھرتی ہو چکا تھا اور وہ بھی ایڈوانس تنخواہ کا تقاضا کر رہی تھی جیسے یہ ذمے واری بھی میری ہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گھر میں اخبار پڑھنے کی فرصت بھی نہ ملی۔ میں نے اخبار اپنے ساتھ اٹھا لیا تاکہ راستے میں پڑھ لوں۔

ایڈیٹوریل صفحے پر میرے چہیتے جرنلسٹ کا مضمون چھپا تھا۔ مضمون کیا تھا لکھنے والے کی انگلیاں چومنے کو جی چاہ رہا تھا۔ کتنا نڈر اور بے باک جرنلسٹ تھا۔ کتنی سچائی تھی اس کی تحریر میں! اس نے اکیلے ہی حکومت کی بدعنوانیوں کا پردہ فاش کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ورق ورق حکومت کو چھیلتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اس کی بے خوفی اور بے باکی پر ناز تھا۔

اندر کہیں سے آواز آئی۔ ''اگر ایسے ہی دس پندرہ کھوجی صحافی اس دیش میں پیدا ہوئے تو اس دیش کے بھاگ کھل جائیں گے۔''

میں اپنے درون کو ٹٹولنے لگا۔

اسی درمیان گاڑی جے جے کالونی کے پاس اچانک زوردار جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ جھٹکے کی وجہ سے میرا اخبار ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر بکھر گیا۔

’’کیوں.....کیا ہوا.....؟رُک کیوں گئے؟‘‘ اخبار سمیٹتے ہوئے میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

’’سر، گاڑی کے نیچے ایک پلاّ آ گیا۔‘‘

سامنے سے ایک بپھری ہوئی کالی کتیا دوڑتی ہوئی چلی آئی اور اپنا خونخوار جبڑا کھول کر سفید ایمبیسڈر کار پر بھونکنے لگی۔ ہمارے ملک کی افسر شاہی میں سفید ایمبیسڈر کا خوب رواج ہے۔ ان ایمبیسڈر کاروں کے سامنے تو بڑے بڑوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ پھر کتوں کی کیا مجال۔ مجھے یقین تھا کی کتیا خود ہی تھک ہار کر چُپ ہو جائے گی۔

’’شاید پلّے کی ماں ہوگی؟‘‘ میں نے ڈرائیور سے پوچھا مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔

ڈرائیور نے پھر سے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا اور پہلے کی مانند ہی اپنی گاڑی دوڑانے لگا۔ کتیا وہاں اس جگہ پر بھونکتی رہ گئی مگر اس آہنی ڈھانچے کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

کانفرنس ختم ہونے کے بعد جب ہم اسی راستے پر لوٹ رہے تھے تو وہی کتیا نہ جانے کہاں سے پھر اسی جگہ پر آن واحد میں نمودار ہو گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح مسلسل بھونک رہی تھی۔ نتیجتاً ڈرائیور اسٹیئرنگ پر قابو نہ پا سکا اور کتیا گاڑی کے نیچے آ کر لہولہان ہو گئی۔

گاڑی تھوڑی دیر کے بعد قابو میں آ گئی اور خود بخود رُک گئی۔

میں گاڑی سے نیچے اُترا۔ اپنے پیچھے نظر دوڑائی۔ وہاں سڑک پر کتیا کی تڑپتی ہوئی لاش تھی، بہتا ہوا اس کا گرم گرم خون تھا اور پھر اس کی پراگندہ انتڑیاں تھیں۔ اس کے منہ میں ابھی بھی ارتعاش تھا اور جبڑے سے خون بہہ رہا تھا۔

کچھ راہ گیر میری طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میں ہی مجرم ہوں۔ ان کی آنکھیں خشمگیں تھیں۔ میں گھبرا کر واپس اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

’’ان لوگوں کو ڈرائیور پر غصہ آنا چاہیے تھا۔ مجھ پر کیوں؟‘‘ میں اپنے آپ سے سوال کر بیٹھا۔

''ڈرائیور پر کیوں؟ کار تو تمہاری ہے۔ پھر دیر بھی تو تمہیں ہی ہو رہی تھی۔'' خود ہی جواب ڈھونڈ لیا۔

اس کالی کتیا پر، جو ایک ماں بھی تھی، مجھے بہت ترس آیا۔

''شاید اس نے ہماری گاڑی کو پہچان لیا ہوگا۔'' میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''ہاں صاحب ایسا ہی لگتا ہے۔ جانوروں کے بارے میں یہی سنا ہے کہ ان کی یادداشت بڑی تیز ہوتی ہے۔ ان کو ذرا سا زک پہنچاؤ تو پلٹ کر کاٹ لیتے ہیں۔ سانپوں کے بارے میں تو میری ماں کہتی تھی کہ مرتے مرتے وہ مارنے والے کی تصویر دل میں اتارتے ہیں اور پھر ان کے بال بچے اس شبیہ سے انتقام لیتے ہیں۔''

بھیڑ میں سے کسی کی آواز آنے لگی۔ ''نہ جانے کس اندھے نے صبح دم اس کے بچّے کو اپنی موٹر کے نیچے روند ڈالا۔ جب سے بے چاری باؤلی ہو چکی تھی اور دن بھر آنے جانے والی گاڑیوں پر بھونکتی رہی۔''

حادثے کے باوجود سڑک پر رات بھر ٹریفک چلتا رہا۔ سبھی اپنی اپنی سمت برق رفتاری سے گامزن تھے۔ سڑک پر نعش پڑی پڑی سڑتی رہی۔ وقتاً فوقتاً گدھ اور کوّے اس میں سے غدود اور مانس نکال کر اڑا لے جاتے۔ راہ رو نعش کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے۔ اپنے منہ کو رومال سے ڈھانک کر دوسری جانب دیکھتے اور تیز تیز قدموں سے آگے نکل جاتے۔

دوسرے روز میونسپل کمیٹی کی کوڑا گاڑی نعش کو اُٹھا کر لے گئی۔

اسی روز اخبار میں بڑی ہی دلچسپ خبر چھپی تھی۔ میرے بطل صحافی نے کابینہ میں وزیر کا حلف اٹھا لیا تھا اور اب اسی نظام کا حصہ بن چکا تھا جس کے خلاف وہ برسوں سے آواز اُٹھا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ الّھڑ لڑکی

کئی گھنٹوں سے میں بس کا انتظار کر رہا تھا مگر بس تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہاں سے بسیں نہیں گزریں، مگر مجھے جس بس کا انتظار تھا وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کئی بسیں آئیں، کچھ رُکیں اور کچھ بنا رُکے چلی گئیں اور میں انتظار کرتا رہا۔ پسینے سے تر بتر لاچار منتظر مسافر..... مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے۔ سبھی دوڑتے بھاگتے ان بسوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند پھرتیلے تربیت یافتہ مسافر کامیاب ہوتے اور باقی ماندہ سڑک پر ہی کفِ افسوس مل کر رہ جاتے۔ اکثر مسافر پائیدان پر زندگی اور موت کے درمیان لٹکتے ہوئے چلے جاتے۔ البتہ میں دیدۂ حسرت لیے اپنی مخصوص بس کے لیے کھڑا انتظار کرتا رہا۔

ویسے تو ہماری روزمرہ زندگی بھی کچھ کم نہیں۔ ایک مرجائے تو دو جنم لیتے ہیں۔ کچھ زندگی کی مسافت جیسے تیسے طے کر پاتے ہیں، کچھ رہ جاتے ہیں اور کچھ لٹکتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

دلّی کی بسیں عموماً ٹھسا ٹھس بھری رہتی ہیں۔ کہیں تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں ملتی۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس کے باوجود لوگ چڑھتے ہیں، لٹکتے ہیں، زور زبردستی کر کے اپنی جگہ بناتے ہیں اور تب جا کر منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں۔

’’آپ کہاں جا رہے ہیں؟‘‘ کوئی دل پھینک قسم کا نوجوان مجھ سے مخاطب ہوا۔

’’جنک پوری۔‘‘

’’اس شہر میں نئے نئے معلوم ہوتے ہیں؟‘‘

’’جی ہاں۔ پہلی بار آ چکا ہوں۔‘‘

’’آپ کی باڈی لنگویج سے ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے۔ آپ بسوں کو دیکھ کر گھبرا رہے ہیں۔‘‘

''بے شک، ہمارے شہر میں ایسی بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی اور پھر سلیقہ بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ یہاں بے چاری عورتیں بھی.........'' میں نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

''ارے بھائی۔'' وہ اجنبی بے تکلفی پر اتر آیا۔''ان بسوں میں کھڑے ہونے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ کسی عورت کے بغل میں کھڑے ہونے کا شرف حاصل ہو تو آپ اس کے بدن کے نشیب وفراز ناپ سکتے ہیں۔ دراصل دلّی میں اکثر مردوں نے یہی مشغلہ اپنایا ہے۔ اگر بس میں بھیڑ نہ بھی ہو تب بھی وہ عورتوں کے اردگرد ایسے کھڑے ہو جائیں گے جیسے اور کہیں جگہ خالی نہ ہو۔ پیٹھیں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔''

''میرے جیسے نو وارد کے لیے یہ کلچرل شاک سے کم نہیں۔ ہمارے یہاں عورت کی بہت عزت ہوتی ہے۔ مجال ہے کوئی مرد سیٹ پر بیٹھا رہے اور پاس میں عورت کھڑی ہو۔''

''اجی صاحب۔ دو چار روز اور رہ لو اور پھر دیکھو کس رنگ میں رنگ جاؤ گے۔ یہاں ایسا ہونے لگے تو پھر کسی مرد کو عمر بھر کبھی سیٹ پر بیٹھنا نصیب نہ ہوگا۔ وہ تو تب کی بات تھی جب عورتیں گھروں میں پردہ کرتی تھیں اور کبھی کبھار مجبوراً گھر سے باہر نکلتی تھیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ عورتیں ایسی بے حیائی اور سینہ زوری کیسے برداشت کر لیتی ہیں۔''

''ایسا بھی نہیں ہے کہ ان عورتوں کو اس بات کا علم نہیں ہے مگر کئیوں نے تو حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے جبکہ کئی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی عادی ہو چکی ہیں۔ اب کیا بتاؤں میں آپ کو۔ میں بھی جب آپ کی طرح اس شہر میں نیا نیا وارد ہو چکا تھا اور کناٹ پلیس سے شکتی نگر جا رہا تھا، راستے میں اک مریل سا بوڑھا ایک کالج گرل سے دست درازیاں کرتا نظر آیا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اسے ٹوکا اور پھر لڑکی سے پوچھا کہ آپ نے مزاحمت کیوں نہیں کی۔ وہ ایسے ہنسی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ بولی۔''ارے چھوڑیے، کتنوں سے دن بھر ماتھا پچی کرتے پھریں۔ پھر ہمارا کیا جاتا ہے۔ چند منٹوں کا سفر ہوتا ہے جوں توں کر کے کٹ جاتا ہے۔ نقصان تو انہی لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ گھر جاتے ہیں۔

ہمارے بدن کے لمس سے رات بھر تڑپتے رہتے ہیں اور پھر اکیلے میں بدفعلیوں پر اتر آتے ہیں۔''
ایسا بے باکانہ جواب سن کر میرے ہوش وحواس اڑ گئے۔ آگے جا کر میں نے یہی محسوس کیا کہ یہ بیماری کسی خاص طبقے، جماعت، عمر یا جنس سے وابستہ نہیں۔ جن لوگوں کی ایک ٹانگ قبر میں لٹک رہی ہوتی ہے وہ بھی سینگ کٹوا کر بچھڑوں میں شامل ہونا پسند کرتے ہیں۔''

''سینگ کٹوا کر نہیں بلکہ گودریج ڈائی لگوا کر....'' میں نے مذاقاً کہا۔

''ارے بھائی، مرد تو مرد عورتیں بھی کچھ کم نہیں ہوتی ہیں۔ کئی عورتیں تو شوقیہ بھیڑ میں گھس کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور عمداً اپنے کولھے مردوں کے راستے میں ایسے اٹکا دیتی ہیں تاکہ ان کی رانوں سے مس ہوتے رہیں یا پھر لوگٹ بلاؤزوں میں سے ابھرتی ہوئی چھاتیوں کی ایسے نمائش کرتی ہیں کہ دیکھنے والے کے جذبات قابو میں نہیں رہتے۔''

''آپ سچ کہتے ہیں۔ زندگی نے کروٹ ہی کچھ ایسی لی ہے کہ اب ان چیزوں پر کنٹرول کرنا ناممکن ہے۔'' ابھی میرے الفاظ حلق سے نکلے ہی تھے کہ جنک پوری کی بس میرے سامنے کھڑی ہوگئی اور میں آخر کار بس میں چڑھ گیا۔

بس مسافروں سے ٹھساٹھس بھری پڑی تھی۔ بھیڑ کے ریلے سے بچنے کے لیے میں نے اوپر لگے ہوئے ڈنڈے کو پکڑ کر اپنے لیے تھوڑی سی جگہ بنالی۔ میرے پیچھے لوگ اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد میرے دائیں بازو میں حرارت سی پیدا ہوئی اور پھر کسی ملائم بازو کے لمس کے سبب عجیب سنسنی سی پیدا ہوئی۔ میں نے کنکھیوں سے اپنی دائیں جانب نظر دوڑائی۔ وہاں ایک حسین، نرم وگداز بدن والی الّھڑ دیہاتی دوشیزہ کھڑی ہرنی کی مانند مسکرا رہی تھی۔ اس کا تھل تھل کرتا ہوا جسم پنیر کا ڈھیلا سا لگ رہا تھا۔ رنگ برنگے پھولدار ملبوسات سے جسم کی دلکشی دوگنی ہو چکی تھی۔ اس کے سینے کا ابھار موسمی چڑ جی کی یاد دلا رہا تھا۔ گردن میں نقرئی ہنسلی، کانوں میں آویزے اور بازوؤں میں رنگ برنگے کنگن اور چوڑیاں اس کے حسن کو چار چاند لگا رہے تھے۔ معمولی

سی جنبش سے بھی اس کی پازیب ایسے بج اٹھتی جیسے کسی نے جلترنگ چھیڑ دیا ہو۔

یوں ہی سفر کرتے کرتے آدھا گھنٹہ ہو گیا۔ سفر بہت لمبا تھا۔ تقریباً بیس پچیس کلومیٹر۔ اور وہ بھی دفتروں کے بند ہونے کا وقت۔ بس کو ہر اسٹاپ پر رکنا پڑتا تھا۔ اگلے دروازے سے ایک مسافر اترتا اور پچھلے دروازے سے دو چڑھ جاتے۔ مسافر میری کمر کو چھیلتے ہوئے آگے نکل جاتے۔ اس کے باوجود میں ساری نقل وحرکت سے بے تعلق ہو چکا تھا۔ وقت گزرنے کا مجھے احساس ہی نہیں رہا۔ اگر مجھے کسی ایک وجود کا احساس تھا تو وہ میرے ساتھ چپٹی اس دوشیزہ کا جو شوخ رنگوں کے دیہاتی لہنگے اور چولی میں ملبوس کسی جنت کی حور سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے بدن کا بیشتر حصہ میرے بدن سے مس ہو رہا تھا یہاں تک کہ میرا بدن سن ہو گیا۔ من ہی من میں یہ سوچ رہا تھا کہ جس لڑکی کے محض چھونے سے سارا بدن تپ جائے، اس لڑکی سے اختلاط حاصل کرنا کتنی خوش نصیبی کی بات ہو گی۔ میری آنکھوں میں غنودگی چھانے لگی اور آگے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

آخر کار وہی ہوا جو ہر سفر کا انجام ہوتا ہے۔ بس آخری اسٹاپ پر آ کر رُک گئی۔ میرا بس چلتا تو ڈرائیور سے کہتا کہ بس کو یونہی چلاتا رہ۔ دراصل جوانی میں جب آدمی رنگ رلیوں میں مست ہوتا ہے تو یہی چاہتا ہے کہ زندگی بس یونہی چلتی رہے۔ سبھی مسافر اپنی سیٹوں سے کھڑے ہو رہے تھے اور آہستہ آہستہ بس خالی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ لڑکی بھی دھیرے دھیرے آگے کھسک رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے ہمیں کلہاڑی سے علیٰحدہ کر دیا ہو۔ خواب سے جو جاگا تو وہ فٹ بورڈ سے نیچے اترتی چلی جا رہی تھی اور مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے میں اس کے پیچھے ہو لیا اور اس کے نزدیک پہنچ کر ہچکچاتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''چلنا ہے.....!'' یہ فقرہ کہتے ہوئے میں چپ چاپ آگے بڑھا اور اس کے ردِّعمل کا انتظار کرتا رہا۔

وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی اور بنا کچھ کہے تھوڑی دوری پر کھڑی ہو گئی۔

میں نے اطمینان سے اس کے معصوم چہرے پر نظر دوڑائی۔ وہ پہلے کی طرح ہی مسکرا رہی تھی

اور میرے ردِ عمل کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے سر سے پاؤں تک اس کا غور سے جائزہ لیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بالکل بدل گئی ہو۔ ماسوا دوشیزگی کے اب مجھے اس لڑکی میں سب کچھ مصنوعی نظر آرہا تھا۔ کانوں کی بالیاں، گردن کی ہنسلی اور پاؤں کی پازیب چاندی کی نہیں بلکہ سستے وہائٹ میٹل کی بنی تھیں۔ دو چوٹیوں میں گتھے ہوئے اس کے بالوں سے باسی کڑوے تیل کی بھبک آرہی تھی۔ پھول پتیوں سے مزیّن چولی اور لہنگے کا کپڑا کسی ہاٹ سے خریدی ہوئی سستی اور معمولی چھینٹ لگ رہی تھی۔ ان پر بے شمار شکنیں پڑ چکی تھیں۔ بازوؤں میں پلاسٹک کے کنگن پہن رکھے تھے جن کے درمیان رنگ برنگی چوڑیاں اٹکی ہوئی تھیں جو خانہ بدوش نٹنیوں کی یاد دلا رہی تھی۔ جونہی میری نظریں اس کے پاؤں پر پڑیں تو میں بھونچکا سا رہ گیا۔ وہاں جوتے یا چپل کا کوئی نام ونشان بھی نہ تھا۔ وہ ننگے پاؤں میرے سامنے کھڑی میرے اشارے کا انتظار کر رہی تھی۔

لڑکی کے اس روپ نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ میں زندگی کے اس دوراہے پر کھڑا تھا جہاں ایک طرف نفسانی خواہش تھی اور دوسری طرف میری عزت۔ ان میں سے ایک کا چناؤ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ حیرت تو اس بات کی تھی کہ لڑکی کا حلیہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا بس میں۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ پھر بھی وہ بالکل مختلف لگ رہی تھی۔

میں اس کے اصلی رنگ وروپ کا تجزیہ کر رہا تھا۔ وہ رنگ جس میں وہ پلی بڑھی تھی۔ وہ روپ جو اس کا گہنا تھا۔ اور وہی رنگ وروپ جس نے چند لمحے قبل میرے بدن کو آتش کدہ بنایا تھا اب ہم دونوں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج پیدا کر چکا تھا۔ وہ پھر بھی ٹکٹکی باندھے مجھے امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

مجھے حال ہی میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں نوکری ملی تھی۔ میں نے جنک پوری میں دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ بھی کرائے پر لیا تھا۔ اپنے آبائی وطن میں میرے پتا جی کی بڑی ساکھ تھی۔ بہت ساری زمین وجائیداد کے علاوہ ان کی دو دودھ کی دکانیں بھی چل رہی تھیں۔ لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

میں اپنی حیثیت کا غور سے مطالعہ کرنے لگا اور پھر اس شوخ لڑکی کی حیثیت کے پس منظر میں تولنے لگا۔ جس دلّی میں کل تک مجھے اپنا آپ اجنبی سا لگ رہا تھا آج اسی دلّی میں ہر شخص جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ گویا میرے حسب ونسب سے مکمل طور پر واقف ہو۔ پھر ایسی حالت میں اس برہنہ پا لڑکی کے ساتھ راستے پر کیسے چل سکتا تھا؟ اس کو اپنے فلیٹ میں کیسے لے جا سکتا تھا؟ اس کو کیسے اپنا بنا سکتا تھا؟ مجھے احساس ہوا کہ اس کا وجود میرے وجود کا تضاد ہے۔

میں نے اس لڑکی کو چلتا کرنے کی ٹھان لی۔ ہاں کچھ انسانیت ابھی بھی باقی بچ گئی تھی۔ چنانچہ میں نے اس لڑکی کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی اور وہ مجھ سے امیدیں لگائے بیٹھی تھی، اب اس کو انکار کرنا معیوب تھا۔ اسی احساس گناہ کے تحت میں نے ہمت بٹور کر اس کی ہتھیلی پر پانسو کا نوٹ رکھ لیا اور گویا ہوا۔ ''معاف کرنا، میرے پاس کوئی ایسی جگہ تو ہے نہیں جہاں میں تمہیں لے جا سکوں اور اپنا بنا سکوں۔ اس پوشاک میں میں تمہیں ہوٹل بھی نہیں لے جا سکتا۔ لوگ ہم پر شک کریں گے۔ ہم راستے پر ایک قدم بھی ساتھ نہیں چل پائیں گے۔''

وہ مجھے گھورتی رہی۔ آناً فاناً اس کے چہرے کی ساری رونق اُڑ گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ جھٹک کر پانسو روپے کا نوٹ سڑک پر پھینک دیا اور چپ چاپ بغیر کچھ کہے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے تاریکیوں میں گم ہو گئی۔

میں تاحدِ نظر اس کے ننگے پاؤں دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆☆☆

ایک خط جو پوسٹ نہ ہوسکا

رگ سنگ، تیسری منزل،

مجنوں کا ٹیلہ، دہلی۔

۱۸ اگست، ۲۰۰۰ء

جانِ من! خوش رہو!!

بہت دنوں سے تمھیں اپنے دل کا حال لکھنے کے لیے بے قرار تھا۔ کبھی ہمت جواب دیتی اور کبھی قلم ساتھ دینے سے انکار کرتا۔ آج خیالات کے ہجوم نے ایسے گھیر لیا کہ بچ نکلنا مشکل ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں اور کہاں پر ختم۔ خیر کہیں سے تو الجھے ہوئے دھاگے کا سرا ہاتھ میں لینا ہی پڑے گا۔

الجھا ہوا دھاگا......! الجھے ہوئے خیالات....! الجھی ہوئی زندگی......! الجھنیں تو میرے وجود کا اٹوٹ حصہ بن چکی ہیں۔

بچپن ہی سے مفلسی کی لمبی سرد راتیں میرے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ اس مفلسی سے جوجھتے ہوئے ساری عمر گزر گئی۔ غریب ہونا بھی ایک لعنت ہے۔ ہنستی کھیلتی اور جگمگاتی اس دنیا کا کوڑھ ہے یہ غربت۔ پناہ لینے کو چھت نہیں، ٹیکنے کو دیوار نہیں، پہننے کو کپڑا نہیں، یہاں تک کہ پاؤں پسارنے کو چادر نہیں۔ اسی ماحول میں کروڑوں لوگ آنکھیں کھولتے ہیں۔ عمر بھر اس کوڑھ کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں اور پھر اپنے زخموں کی تاب نہ لاکر دم توڑتے ہیں۔ ان کوڑھیوں کے پھیلے ہوئے ٹنڈ منڈ ہاتھ تا عمر بند نہیں ہوتے۔ وہ مر کر بھی کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔ اس کے باوجود انٹلکچول لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کوڑھ زدہ زندگی کی کوئی غرض و غایت ہے۔ خدا نے بشر کو اعلیٰ مقصد کے تحت اشرف المخلوقات بنایا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس نے صرف انسان بنایا اور اس کے ساتھ یہ کوڑھ بھی پیدا

کیا۔

مجھے پھر بھی امید تھی کہ کبھی نہ کبھی پو پھٹے گی، تاریکی چھٹے گی اور نیا سویرا ہوگا مگر یہاں کی صورت حال اس کے برعکس نکلی۔ ابھی اندھیرا چھٹا ہی تھا کہ سارا آسمان سر پر ٹوٹ پڑا۔ مانو عقاب کی طرح پر تولے بیٹھا ہوا تھا۔ اس مصیبت نے میرے پورے وجود کو از سرِ نو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔ اُدھر بینائی جانے لگی اور اِدھر دماغ مفلوج ہونے لگا۔ اس حالت میں مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔

جب اپنی حالت زار پر سوچتا ہوں تو ان لوگوں پر ترس آتا ہے جو لمبی زندگی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ شاید ان کو گلے ہوئے، جسم گھسیٹتے ہوئے ان مفلوج اور اپاہج لوگوں پر نظر نہیں پڑتی جو زندگی کے بدلے موت خریدنے کو تیار رہتے ہیں۔ اتنی طویل زندگی کو لوگ صرف چار دن کا کھیل سمجھتے ہیں۔

ہے... ہے!

ابراہیم ذوق نے تو یہاں تک کہا ہے ؎

ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ　　　ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے، ابھی گئے

کیا ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ انسان کی طویل عمر ہی اس کا مستقل عذاب ہے۔ اتنی مدّت میں اگر آدمی کچھ کر نہیں پاتا تو اس کی اپنی کوتاہی ہے۔ اس میں خدا کا کیا قصور۔ اگر انسان کی اوسط عمر اسّی سال مان لی جائے، معلوم ہے اس میں کتنے منٹ ہوتے ہیں؟ پچیس کروڑ، بائیس لاکھ اور اٹھاسی منٹ۔ اتنے سارے منٹوں کو ہم چھوٹی سی عمر کہتے ہیں! افسوس! صد افسوس! اکثر و بیشتر لوگ اتنی طویل زندگی کو محض کھانے پینے، سونے جاگنے اور موج مستی کرنے میں اڑا دیتے ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ ہر صبح پروردگار سے دعا مانگتے ہیں کہ انھیں لمبی عمر عطا کرے۔

لو، میں انھیں کیا دوش دوں۔ میں خود بھی انھی لوگوں میں سے ایک ہوں۔ صبح آنکھ کھلتے ہی منہ میں کلوز اَپ کی جھاگ پیدا کرنے میں بڑے انہماک سے جُٹ جاتا ہوں۔ پھر وہی غسل، ناشتہ،

اسکوٹر، آفس کی فائلیں۔ دو نمبر کی آمدنی، کون بنے گا کروڑ پتی اور.... بستر!

کئی بار مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ہی امیتابھ بچّن کے سامنے بیٹھا اس کے ہر سوال کا جواب دے رہا ہوں اور وہ ہر بار یہی دہراتا ہے۔'' آپ کا جواب صحیح ہے۔''

میں بھی کیسا پاگل ہوں۔ مجھے تو سب سوالوں کا جواب معلوم ہے۔ پھر کیوں میری انگلیاں ٹیلی فون تک نہیں پہنچ پاتیں؟ کیا مجھے اپنے اوپر اعتماد نہیں؟

میرے کانوں میں سامنے سے آواز آتی ہے۔'' کانفڈینٹ(Confident)۔

میں چونک جاتا ہوں۔ امیتابھ جی بول اٹھتے ہیں۔''یہاں پر ہم لیں گے ایک چھوٹی سی بریک۔''

مڑ کر دیکھتا ہوں تو دو تہائی زندگی بنا کسی بریک کے گزر چکی ہے اور حاصل کچھ بھی نہیں۔ وہ جو مجھ میں تخلیق کا مادہ تھا وہ اندر ہی اندر ٹھنڈا پڑتا گیا اور اب.... صرف میں ہوں.... میں.... اور میرا کلوز اَپ... میرا اسکوٹر..... میری فائلیں..... میرا ٹیلی ویژن..... اور میرا بستر......! غور سے دیکھتا ہوں تو پچانوے فیصد لوگوں کی زندگی بنا کسی مقصد کے ایسے ہی گزر جاتی ہے۔

اپنی ناکامی سے جھنجھلا کر میں بارہا آس پاس کی چیزوں سے بدظن ہو گیا حتیٰ کہ تم سے بھی۔ دفتر میں لڑکیوں کے طور طریق دیکھ کر مجھے تم پر سے وشواس ہی اٹھ گیا۔ تمہارے کردار میں بھی وہ سارے عیب نظر آنے لگے جو ایک سفلی پیکر میں ہو سکتے ہیں۔ میں اپنے تصور کا قیدی بن گیا اور تم سے دور رہنے کا عزم کر لیا..... دور.... بہت دور....!

تین مہینے پہلے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ کئی روز سے میں شدت سے ٹیلی فون کا انتظار کر رہا تھا۔ تمھارے ٹیلی فون کا نہیں البتہ 'کون بنے گا کروڑ پتی' کا۔ انھوں نے چند ایک سوال پوچھے جن کے میں نے صحیح جواب دے دیے تھے۔ تب سے ان کے بلاوے کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان کا ٹیلیفون ضرور آئے گا۔

اس دن جو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، میں نے لپک کر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھالیا۔ وہاں دوسری جانب سے تمھاری آواز سنائی پڑی۔ میرے ہوش وحواس ہی اُڑ گئے۔ میں تمھارے سوالوں کا 'ہوں ہاں' میں جواب دیتا رہا مگر سچ تو یہ ہے کہ اس وقت میں تم سے گفتگو کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ دل چاہتا تھا کہ تم جلدی سے بات ختم کرو اور میں ریسیور ٹیلیفون پر واپس رکھ دوں کیونکہ ایک کروڑ کی گھنٹی بجنے والی تھی۔

سچ مانو تو مجھے اب یہ بھی یاد نہیں کہ اس روز ہمارے بیچ کیا باتیں ہوئی تھیں۔ صرف تمھاری ایک بات کانوں میں چھید کر کے چلی گئی تھی۔ ''میری شادی اگلے سوموار کو طے ہوگئی ہے۔ میرا ہونے والا ہسبنڈ مسقط میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کام کرتا ہے۔ سو چا تم کو اطلاع دوں۔ آخر کب تک میں تمھارا انتظار کرتی پھروں۔ والدین کو روکنا مشکل ہو رہا ہے۔''

میں نے کسی ردِ عمل کے بغیر ہی ٹیلیفون رکھ دیا تھا۔

ایک مہینے بعد تمھارا پھر ٹیلیفون آیا۔ اس دن تک کروڑ پتی بننے کے سارے سپنے چکنا چور ہو گئے تھے۔ کے بی سی کے کال کا بہت انتظار کیا تھا میں نے۔ پھر کسی نے بتایا کہ دس لوگوں میں سے ایک ہی آدمی کو کال آجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میں ان نو بد نصیبوں میں سے تھا جن کا نصیب جاگ کر پھر سو گیا تھا۔ تمہاری آواز سن کر مجھے قدرے تسلی ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے زخمی جگر پر مرہم رکھ دیا ہو۔ آخر یہ تو بتاؤ کہ تمھاری شخصیت میں ایسا کون سا مقناطیس ہے کہ چند الفاظ نے میرے پژمردہ جسم کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ جبکہ مجھے بخوبی معلوم تھا کہ تم مجھ سے کوسوں دور سمندروں کے اس پار پیٹرو ڈالروں (Petro-Dollars) کی سیج پر لیٹی ہوئی ہو اور یہ تمھاری آواز محض ایک بازگشت ہے۔

حیران و پریشان میں اپنے ٹیلیفون کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ کہاں تو میں اپنی بچی کھچی سانسیں گن رہا تھا اور کہاں تم نے پھر سے جھنجھوڑ دیا۔ تمھاری آواز نے میرے سارے بدن میں سنسنی پھیلا

دی ہے۔ میں تو مر جانا چاہتا ہوں۔ موت کی آغوش میں ابد کی نیند سو جانا چاہتا ہوں۔ گھڑی کی ٹک ٹک ہی میرا واحد سہارا ہے۔ تم اسے مت چھین لو! یہ میری زندگی کا جامِ ساعت نما ہے۔ اسے میرے سامنے میز پر ہی رہنے دو۔

میرے خواب اب میرے نہیں۔ میری زندگی بھی اب میری نہیں۔ میری موت کو تو میری رہنے دو۔

بنام۔ لیلیٰ لکھنوی — تمھارا بسمل

معرفت مسعود بن عشاق — مجنون صحرائی

۳/۱، دینار منزل، مسقط

نوٹ: میں نے یہ پرسنل خط اپنی معشوقہ کو اس کی سسرال کے ایڈریس پر مصلحتاً نہیں بھیجا، اس لیے میری فائل میں پڑا رہا۔ کچھ دن پہلے ایک معزز مدیر نے تازہ افسانے کی مانگ کی۔ بہت کوشش کے باوجود کوئی نیا پلاٹ نہیں سوجھا۔ ان ہی دنوں میں ساحر لدھیانوی کی ایک نظم 'فنکار' پڑھ رہا تھا جس کا ایک بند یہاں درج کر رہا ہوں۔

میں نے جو گیت تیرے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
آج دُکان پہ نیلام اٹھے گا ان کا
تو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبت کی اساس

میرے پاس گیت تو تھے نہیں البتہ یہ خط تھا جس کو افسانے کا روپ دے کر روانہ کر دیا۔ معاوضے کے منی آرڈر کا ابھی تک انتظار ہے۔

☆☆☆☆☆

سپنوں کا شہر

فائلیں !فائلیں !فائلیں! دفتر تھا یا محافظ خانہ۔زندہ انسانوں کے ریکارڈ۔مردہ انسانوں کے ریکارڈ۔ یہ فائلیں بولتی تھیں۔ گواہیاں دیتی تھیں۔انسانوں کو بے گناہ یا مجرم ٹھہراتی تھیں اوران ہی فائیلوں سے گھِرا تھا ایک ادنیٰ کلرک۔ نام تھا کیلاش۔ان فائلوں کے بغیر اس کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔کبھی کبھی اپنے دفتر کو دیکھ کر وہ حیران ہوتا کہ خدا نے نسل در نسل اربوں کھربوں انسانوں کے اعمال ناموں کا ریکارڈ کیسے سنبھال کر رکھا ہوگا۔

آج بہت مدّت کے بعد کیلاش قدرے خوش نظر آرہا تھا۔کچھ دیر پہلے ہی وہ ساری فائلیں نبٹا کر اپنی میز صاف کر چکا تھا۔حالانکہ وہ عادتاً دفتر کی فائلوں میں گھس کر جگالی کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔اور کرتا بھی کیا؟ روز روز فائلوں کا نپٹارا کرتے ہوئے ایک مشین بن کر رہ گیا تھا۔وہی درخواستیں ،وہی اپیلیں، وہی پٹیشن ۔وہی انگور کی بیل کی مانند فائلوں پر الجھے ہوئے نوٹ ۔وہی ٹالنے والے فیصلے۔

اور لوگ سمجھتے تھے کہ وہ جان بوجھ کر فائلیں نبٹانے سے گریز کرتا ہے تا کہ ان فائلوں میں سے دودھ دوہتا رہے۔

دفتر سے باہر نکلتے ہی کیلاش نے اطمینان کی گہری سانس لی۔آسمان کی طرف جو دیکھا وہاں تھکا ہوا سورج لہولہان ہو رہا تھا۔اس کی چھینٹیں سارے افق پر لالی بکھیر رہی تھیں۔پرندوں کے پرے دن بھر کی تگ ودو کے بعد مایوس و خاموش اپنے آشیانوں کی جانب لوٹ رہے تھے۔اِدھر سیمنٹ کنکریٹ جنگل میں سے ابھرتی ہوئی تھکی ماندی روحیں آرام کی خاطر پر سکون گوشوں کی تلاش میں سڑکوں پر بھٹک رہی تھیں۔اسی بھیڑ میں کیلاش بھی گم ہونے کا متمنی تھا۔

اسے گھر جانے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ وہاں اکیلے پڑے پڑے دیواریں کاٹنے کو دوڑتی تھیں۔ جب سے وہ اس میٹروپالیٹن شہر میں وارد ہوا تھا، جاگنا، ناشتہ کرنا، بسوں اور ٹرینوں کے پیچھے دوڑنا، آفس کی فائلوں میں گھس کر مکھیاں مارنا اور واپسی پر کسی ریستوران یا بار میں کافی یا بیئر پی کر گھر لوٹنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ چرخ نما زندگی میں کہیں بھی کوئی امید کی کرن نظر نہیں آتی تھی۔

''کیا سوچ کر چلا آیا تھا یہاں۔ اور اب کیسے فضول کٹ رہی ہے میری زندگی۔'' بیئر کے سِپ لیتے ہوئے کیلاش سوچ کے سمندر میں ڈوب گیا۔

چار سال قبل وہ گریجویشن کر کے اس شہر میں ڈھیر سارے خواب لے کر وارد ہوا تھا۔ شروع میں ایک دوست کے ہاں پناہ لی۔ قسمت اچھی تھی کہ چھ مہینوں ہی میں ایک پرائیویٹ فرم میں معمولی سی نوکری مل گئی ورنہ ابھی تک راستہ ناپ رہا ہوتا یا پھر انڈر ورلڈ کی نذر ہو چکا ہوتا۔

بیتی ہوئی زندگی کی بازگشت اس کے دماغ میں تلاطم پیدا کر رہی تھی۔

''کیا رکھا ہے اس گاؤں میں؟ کوئی کالج نہ یونیورسٹی۔ لے دے کے ایک ہائر سیکنڈری اسکول ہے جہاں ہمیشہ استادوں کی کمی رہتی ہے۔ دو چار دفتر جہاں کام کم اور آدمی زیادہ ہیں۔ بجلی آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ گرمیوں میں لوگ جھلستے ہیں۔ مجال ہے کہ انتظامیہ ٹس سے مس ہو جائے۔ صبح و شام کھیتوں میں خون پسینہ بہاتے رہو۔ کنبے کے سبھی افراد آٹھوں پہر فصل کی دیکھ بھال کرو۔ اگر قسمت اچھی ہوا اور سیلاب یا خشک سالی سے فصل بچ جائے تب کہیں چند سکوں کا منہ دیکھنا نصیب ہوگا۔ ادھر اناج بکا نہیں ادھر قرض خواہوں کی قطار لگ گئی۔ خدا جانے اس مصیبت سے کبھی چھٹکارا ملے گا بھی یا نہیں۔

یہاں تفریح کے ذرائع بھی میسر نہیں۔ ایک سینما گھر ہے اور وہ بھی دس کلومیٹر دور قصبے میں۔ اور پھر میرے جیسے آدمی کا یہاں کیا کام؟ یہاں رہتے رہتے سڑ جاؤں گا۔ مجھے جینے کی آرزو ہے۔ اڑنے کی تمنّا ہے۔ میں آگے تعلیم حاصل کر کے کچھ کر کے دکھاؤں گا۔''

یہی خواب لے کر کیلاش نے اپنے پرکھوں کے گاؤں کو الوداع کہا تھا۔ سوچا تھا کہ دن بھر نوکری کرے گا اور شام کو ایوننگ کلاسز جوائن کر لے گا۔ ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کر کے ساری دنیا سے اپنا لوہا منوا لے گا لیکن اسے آنے والی مشکلات کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ نوکری ملتے ہی رہائش کے لیے کمرہ ڈھونڈنا بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ کمرہ جو مل بھی گیا وہ ایک گورنمنٹ بنگلے کا گیراج تھا۔ رات بھر گرمی سے بچنے کے لیے کھاٹ باہر بچھانی پڑتی تھی۔ ایک طرف اپنا خرچ اور دوسری طرف گاؤں سے گھر والوں کے تقاضے۔ اس مصیبت سے بچنے کا بس ایک ہی طریقہ نظر آیا اور وہ تھا دفتر بند ہونے کے بعد اوور ٹائم کرنا۔ نتیجتاً دن گزرنے کا کچھ پتہ بھی نہ چلتا۔ بسوں کا انتظار، میلوں کی مسافتیں، آفس کا کام، اور اس پر اوور ٹائم۔ پھر اپنی نجی زندگی سنوارنے کی فرصت کہاں مل پاتی۔ اس طرح ایک ایک کر کے وہ سارے ارمان سینے ہی میں دفن ہو کر رہ گئے جن کی آبیاری کرنے وہ اس اجنبی شہر میں آچکا تھا۔

جس ریستوران میں وہ بیئر پی رہا تھا وہاں گھپ اندھیرا تھا البتہ میز پر ٹارچ لائٹس کی مانند پتلی سی روشنیاں مرکوز تھیں۔ کچھ سوچ کر اس نے کملی کا خط، جو آج ہی ڈاک سے موصول ہوا تھا، جیب سے نکالا اور پڑھنے لگا۔ گو وہ اس خط کو دفتر میں کئی بار پڑھ چکا تھا تاہم اس ماحول میں خط پڑھنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔

خط کی عبارت سے وہ تلملا اٹھا۔ اس نے بیئر کا پورا گلاس ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اُتارا اور بیرے کو دوبارہ گلاس بھرنے کا اشارہ کیا۔

''میں گھر چھوڑ کر یہاں کیوں چلا آیا؟'' وہ اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا۔ ''کیا رکھا ہے اس شہر میں۔ صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح کام کرتے رہو۔ پھر مہینے کے اختتام پر چند سکّے ہاتھ میں لے کر اپنے آپ کو تسلیاں دیتے رہو۔ اس سے پہلے ہی قرض خواہوں کے بل آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ گیراج کو گھر سمجھ کر زندگی بسر کر لو۔ انٹرٹیمنٹ (Entertainment)، شِٹ! کسے معلوم کس

شئے کا نام ہوتا ہے۔ جہاں جینے کے لالے پڑے ہوں وہاں تفریح کا کیا کام۔

تاریکی میں ہلکی ہلکی موسیقی تیر رہی تھی۔ٹارچ لائٹوں کی روشنی میں کرسیوں پر بیٹھے لوگوں کے چہرے نیم روشن تھے۔کیلاش یہاں کے ماحول سے خاصا واقف تھا۔سامنے ایک نوجوان اپنی محبوبہ سے بغلگیر تھا۔وقتاً فوقتاً وہ ولائتی سگریٹوں کا دھواں اپنی محبوبہ کے چہرے پر پھینکتا جس کو وہ پینے کی ناکام کوشش کرتی۔نوجوان مہاتما گاندھی میڈیکل کالج کا طالب علم تھااور مدھیہ پردیش سے حصول تعلیم کے لیے آیا تھا۔باپ ایک نامورذی عزت کھدّرپوش سیاست داں تھا جس کی ابن الوقتی اس کے آڑے آئی تھی۔اس کے بیٹے کو نہ صرف میڈیکل سیٹ بلکہ حصول تعلیم کے لیے قرضہ بھی مل چکا تھا جس کو وہ رات دن ان تاریک گوشوں میں نوخیز جوانیوں پر لُٹا رہا تھا۔کیوں نہ لٹاتا،روپیہ پیسہ تو آنے جانے والی شئے ہے۔

نوجوان کے بغل میں اس کی محبوبہ نہیں تھی۔لیڈی ہیملٹن کالج کے گیٹ پر ایسی لڑکیاں اکثر مل جاتی ہیں بشرطیکہ آپ کو ان کی خاطرداری کرنے میں کوئی پس وپیش نہ ہو۔ایک بار جو لڑکی اس کے ہمراہ چلی آتی پھر دوبارہ اس کے ساتھ دکھائی نہیں دیتی تھی۔لڑکی اپنی گھڑی بار بار دیکھتی جارہی تھی تاکہ نوجوان کو یاد دلائے کہ ہوسٹل کے دروازے پھر بند ہوجائیں گے۔

''ڈارلنگ،اب چلنا چاہیے۔بہت دیر ہوگئی۔''

''ارے تم فکر مت کرو۔میں تمھیں ہوسٹل چھوڑ آؤں گا۔''

''جیسی تمھاری مرضی۔نو،لیٹ اُس گو۔''

کیلاش کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کی غیر حاضری میں اس کے گیراج نما گھر کے سارے دروازے کھول کر اس کو ننگا کردیا ہو۔وہ ٹھٹکا۔پھر ایک سگریٹ سلگایا۔جونہی آنکھیں دیا سلائی سے اٹھالیں سامنے دروازے سے اس کا پڑوسی کرشن لال اندر آتا دکھائی دیا۔

کرشن لال اپنے محلے میں اس لیے مشہور تھا کیونکہ اس کے گھر میں ہر شام مہابھارت چھڑ

جاتی۔ ایسا کوئی بھی دن نہ تھا جب کرشن لال اپنے گھر نشے کی حالت میں نہ لوٹتا۔ گھر میں جو بیوی روپے پیسے کا تقاضا کرتی تو وہ بپھر جاتا اور اس کو بے دردی سے پیٹتا۔ محلے والے شور وغل سن کر اس کی گرہستی میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ بہت سمجھاتے بجھاتے مگر کرشن لال کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔

آج ریستوراں میں اس کے ساتھ اس کی بیوی نہیں بلکہ اس کے سیکشن آفیسر کی بیوی شکنتلا تھی۔ ایک بار وہ اپنے پتی کے ہمراہ آفس آئی کہ کرشن لال نے اس پر جادو سا کر دیا۔ تب سے وہ اپنی تنہائی اور بوریت سے فرار پانے کے لیے کرشن لال کے ہمراہ ریستورانوں کے چکر لگاتی رہتی ہے۔

یہ سب کچھ دیکھ کر کیلاش کو کملی کی یاد ستانے لگی۔ گاؤں کی وہ معصوم گوالن جو صبح سویرے گھر پر دودھ دے جایا کرتی تھی۔ وہ اتنی حسین تھی کہ گلاب بھی شرما جاتا۔ حالانکہ وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی اور اب دودھ بانٹنا ترک کر لیا تھا تاہم کیلاش کے گھر میں راتب دودھ دے جایا کرتی کیونکہ کیلاش نے اس کی پڑھائی میں مدد کی تھی۔

میٹرک پاس کرتے ہی گھر کے بزرگوں نے کملی کی پڑھائی بند کروانے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ زیادہ پڑھنے لکھنے سے لڑکیاں بے شرم اور بے حیا ہو جاتی ہیں۔ سادہ لوح انسانوں کے اوہام بھی ان کی زندگی کی مانند عجیب وغریب ہوتے ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ میٹرک سے آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے لڑکی کو پاس ہی قصبے کے کالج میں داخلہ لینا پڑے گا جہاں مخلوط تعلیم ہے۔ وہ اپنی وضع قطع بھول جائے گی اور کسی دن دوسری ذات والے چھوکرے کے ساتھ بھاگ جائے گی۔ جیسے کُنتی اور شیاما بھاگ گئی تھیں۔ اور پھر نہ جانے گاؤں والوں سے کیا کیا سننا پڑے گا۔

کملی کی پڑھائی چھوٹنے سے کیلاش کو بہت صدمہ پہنچا۔ اسی دن کیلاش نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ وہ کملی کو اپنے ساتھ شہر لے جا کر اس کو پڑھائے گا، لکھائے گا تاکہ اس کی شخصیت نکھر جائے۔

کتنی خوش نصیب تھی کملی کہ اب اس کا چہیتا وہاں شہر میں کام کرنے لگا تھا۔اس نے سنا تھا کہ شہر میں خوب رونق ہوتی ہے۔چہل پہل ہوتی ہے۔وہاں کی عالیشان عمارتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔بٹن دباؤ تو زمین سے آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔وہاں تو اندھیرے بھی اجالے بن کر رہ گئے ہیں۔''وہاں کی شامیں کتنی حسین ہونگی؟'' وہ ہمیشہ اپنے آپ سے پوچھتی۔''وہ شہر کیسا ہوگا؟ کیا کیلاش تمھیں یاد کرتا ہوگا یا اس شہر کی رنگینیوں میں کھو کر تمھیں فراموش کر چکا ہوگا؟ وہ تمھیں اپنانے کے لیے کبھی آئے گا بھی یا نہیں؟ کیا وہ اڑن کھٹولے میں تمھیں لے جائے گا یا نہیں؟''

کیلاش کملی کا خط کئی بار پڑھ چکا تھا۔اختتامی جملے اس کو کچو کنے لگے۔''کیلاش، میرے کیلاش ،تم واپس آکر مجھے یہاں سے کب لے جاؤ گے۔دیکھو شادی کے بعد تم مجھے پڑھنے سے نہیں روکنا۔میں تعلیم حاصل کر کے بڑا نام کمانا چاہتی ہوں۔میں تمھارے انتظار میں کب سے بیٹھی تڑپ رہی ہوں۔تمھاری سدا تمھاری۔کملی۔''

کیلاش نے اب کی بار جو نظریں اٹھائیں دوسری میز پر اس کے پڑوسی کرشن لال نے اپنے سیکشن آفیسر کی بیوی کو دبوچ رکھا تھا۔اس کے اردگرد ایسی کوئی بھی میز نہیں تھی جہاں ایسے عارضی جوڑے بیٹھے نہ تھے۔کسی کے ساتھ اس کے افسر کی بیوی تھی اور کسی کے ساتھ اس کے گھر کی نوکرانی۔ کسی کے ساتھ اس کے بہن کی سہیلی اور کسی کے ساتھ اس کے کالج کی ہم جماعتی۔اس کے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوگئی اور وہ اپنے ساتھ بڑبڑانے لگا۔''نہیں کملی، نہیں...تم میرا انتظار مت کرو۔ میں تو تمھیں چھوڑ کر یہاں چلا آیا ہوں۔ورنہ گاؤں کی اچھی بھلی زندگی کو ٹھکرا کر یہاں کیوں چلا آتا۔ میں تم سے ہمیشہ آدھا سچ بولتا رہا۔تم کو اس شہر کی رنگینیوں کے بارے میں لکھتا رہا۔یہاں کی رونق اور چہل پہل کے بارے میں لکھتا رہا۔مگر اس کا دوسرا رخ تمھیں نہیں معلوم۔یہ شہر ایک سراب ہے۔نظر کا دھوکا ہے۔یہاں کے دیوتا نرالے ہیں۔یہاں ہم جیسے لوگوں کو ہر نوالے کے لیے عصمت کا سودا کرنا پڑتا ہے۔ہر آواز میں بھوک کی تڑپ ہے۔ہر سانس میں شہوت کی بُو ہے۔ہر چہرے پر خوف و

ہراس کا جالا بُنا ہوا ہے۔ یہاں کے اسکائی سکر یپروں نے نیلگوں آسمان کو ڈھک تو لیا ہے مگر ان کے عقب میں بنی ہوئی جھونپڑیوں سے عفونت اور تے کی سڑاند آتی ہے۔اس پس منظر میں تم یہاں آ کر کیا کرو گی۔ میں نے بھی اپنی آنکھوں میں کئی خواب سجائے تھے۔سب دھیرے دھیرے چکنا چور ہو گئے۔ پھر تم تو مزید بوجھ بن جاؤ گی۔ کملی، میری تنخواہ اتنی قلیل ہے کہ اپنا گزارہ نہیں ہو پاتا پھر تمھارا خرچہ کیسے برداشت کر سکوں گا۔ یہاں تم کچھ کما بھی نہ سکو گی، گھر گھر دودھ بھی نہ بیچ سکو گی۔ یہاں تمھاری عزت کی کوئی گارنٹی نہیں۔ کملی تم جیسی ہو، جس حال میں ہو، بہت اچھی ہو۔ محفوظ ہو.....نہیں کملی تمھیں ان بھیڑیوں کے شہر میں لانے کا پاپ میں نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ تڑپ اٹھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں دھند لکا چھانے لگا۔ دبے ہوئے اختلاج قلب نے پھر سر اٹھا لیا۔

''کملی نہیں کملی، اس شہر میں تم سدا میری نہ رہ سکو گی۔ کملی، تم گاؤں ہی کی رہو۔ میں نے تو اپنی زندگی اس شہر کے پاس گروی رکھ لی ہے۔''

غیرارادتاً اس نے کملی کے خط کو اپنے ہاتھ میں بھینچ لیا۔ اس کے سینے میں زور کا درد اٹھا۔ ماتھے پر پسینے کی قطاریں نمودار ہو گئیں اور ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب آنکھ کھلی، تو اس نے اپنے آپ کو گورنمنٹ اسپتال کے کارڈیک وارڈ میں اپنی زندگی کی آخری جنگ لڑتے ہوئے پایا۔

☆☆☆☆☆

آخری سبق

کورومنڈل ایکسپریس سے میں بنگلور جارہا تھا۔ سامنے والی برتھ پر ایک وجیہ نوجوان آکر بیٹھ گیا۔ ویسٹ اور جینز میں ملبوس، چھوٹے چھوٹے بال، لمبوترا چہرہ، مضبوط جبڑے اور ڈاڑھی مونچھ صفاچٹ۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے اپنا وی آئی پی سوٹ کیس سیٹ کے نیچے رکھوادیا اور قُلی کے ہاتھ ایک چمچماتا ہوا بیس روپے کا نوٹ تھمادیا۔ قلی دعائیں دیتا ہوا آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

گاڑی حرکت میں آگئی۔ کچھ دیر بعد نوجوان نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک انگریزی فلم میگزین نکالا اور اس کی ورق گردانی شروع کی۔ وہ ہمہ تن متوجہ نہیں ہو پارہا تھا۔ بار بار میگزین کھولتا دو چار سطریں پڑھ لیتا اور پھر بند کردیتا۔ آدمی کا داخلی اضطراب اس کے ظاہری افعال سے معلوم ہوجاتا ہے۔ کہیں کوئی کانٹا تھا جو اس کے دل میں چبھ رہا تھا۔ ویسے بھی حرکی زندگی کی آرزو، جوکھم کی تلاش، اور خوب سے خوب تر کی طلب اس عمر کا تقاضا ہے۔ اس کے من کا بھنورا پھول پھول باغ باغ منڈلانا چاہتا تھا۔

کمپارٹمنٹ میں صرف چار مسافر تھے۔ سیکنڈ کلاس ہوتا تو ایک دوسرے سے گفتگو کرنے میں دیر نہیں لگتی لیکن فرسٹ کلاس میں عالم طور پر مسافر کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سامنے والا مسافر بات کرنے کی پہل کرے تاکہ ان کی برتری کی مہر ثبت ہو۔ کبھی کبھی پورے سفر کے دوران مسافر اجنبیت کی چادر اوڑھ کر اپنے ہی اندر سمٹے سمٹائے چلے جاتے ہیں۔ وہ جس اجنبیت کے ساتھ ڈبے میں داخل ہوتے ہیں اسی اجنبیت کے ساتھ رخصت بھی ہوتے ہیں۔

نوجوان اس برف کی سِل کو توڑنے کے لیے بے قرار تھا۔ اگلے اسٹیشن پر جونہی گاڑی رُکی اس نے تینوں مسافروں کو چائے پینے کی دعوت دی۔ میری بغل میں بیٹھا فربہ مارواڑی اونگھ رہا تھا۔ اس

نے ہاتھ کے اشارے سے انکار کرلیااور خوداوپر والی برتھ پر چڑھ کر سوگیا۔دوسرے شخص نے بھی نفی میں سر ہلایا۔ باقی رہامیں۔میں بے صبری سے چائے کاانتظار کررہا تھا پھراس کی پیش کش کوکیسے ٹھکرا تا۔

چائے کے گھونٹ پیتے ہوئے میں نے نوجوان سے پوچھا۔''آپ کہاں جارہے ہیں۔''

نوجوان کا چہرہ کھل اٹھا۔''سر، میں بنگلور جارہاہوں۔''

''وہاں آپ نوکری کرتے ہیں کیا؟''

''نہیں سر، میں وہاں آرمی اسکول آف میکانکل ٹرانسپورٹ میں ڈی اینڈ ایم کورس کرنے جارہا ہوں۔''

''تعجب ہے آپ آرمی افسر لگتے ہی نہیں۔آپ کی وضع قطع دیکھ کر میں آپ کو فارنر سمجھ بیٹھا تھا۔''

''سر میرا نام لیفٹننٹ ابھے پانڈے ہے۔ٹو فائیو تھری فیلڈ رجمنٹ میں ہوں۔لکھنؤ یوپی کا رہنے والا ہوں۔''

''نائس ٹو میٹ یو۔میں ہوں میجر کے سی والیا فرام آرمی پوسٹل سروس۔سرپرائزنگ! میں بھی اسی کورس کے لیے جارہاہوں۔''

''سر، آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔''

دونوں فوج سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ سن کر گفتگو میں اپنائیت عود کر آ گئی۔فوج ایک ایسی تنظیم ہے جہاں اجنبی وردی پوش چہرے اپنوں سے زیادہ قریب لگتے ہیں۔ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے کے لیے جان تک قربان کرتے ہیں۔بھائی چارے کی اس سے بڑھ کر مثال اور کہیں نہیں ملتی۔

دوروز کے طویل سفر کے دوران میں ایسا کوئی اہم موضوع نہیں تھا جو زیر بحث نہیں آیا۔یوپی اور بہار کی سیاست، ملک کی سالمیت، نئی اور پرانی فلمیں، فلمی ہیرو اور ہیروئنیں۔حال ہی میں کھیلی گئی انڈیا آسٹریلیا کرکٹ سیریز۔بہرحال ان سب موضوعات میں سے اگر کوئی موضوع غالب رہا تو وہ

تھا عشق کا۔ یہ ایک ایسا آفاقی موضوع ہے جس پر ہر کسی کا تجربہ الگ اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے جتنے منہ اتنے ہی قصے۔

چنانچہ میں بذات خود محکمہ ڈاک کا ملازم تھا اور فوج میں کچھ وقت کے لیے ڈیپوٹیشن پر آیا تھا۔ اس لیے مجھے بحث ومباحثے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ ابھے فوجی ہونے کے ناطے تول تول کر اور ماپ ماپ کر باتیں کر رہا تھا۔ میری سینیارٹی کو نظر میں رکھ کر اسے عشق کے معاملات پر کھل کر اپنی رائے دینے میں ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ اس ہچکچاہٹ کو دور کرنے کے لیے مجھے خود ہی کافی پیش قدمی کرنی پڑی۔

سفر تمام ہوا۔ ہم نے اسکول میں داخلہ لیا۔ دوسرے روز چھٹی تھی۔ چنانچہ میں اور ابھے ایک دوسرے سے گھل مل گئے تھے اس لیے دن بھر اکٹھے گھومتے پھرتے رہے۔

''سر کل آپ کہہ رہے تھے کہ آپ غرض مند لڑکیوں کی پہچان کر سکتے ہیں۔ آج کچھ پریکٹکل ڈمانسٹریشن ہو جائے۔'' ابھے نے مودبانہ لہجے میں التماس کیا۔

''کیوں نہیں......کیوں نہیں.....''

ہم ایم جی روڈ سے برگیڈ روڈ کی طرف مڑے۔ کچھ فاصلے پر میری نظر ایک لڑکی پر پڑی جو اکیلی، بالکل اکیلی تھی اور اپنے گرد و پیش میں نگاہیں ایسے دوڑا رہی تھی جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ اس کا میک اَپ اور ڈریس اس کے پیشے کا اشتہار تھا۔ میں نے ابھے کو اشارہ کر کے سمجھایا۔ ''وہ لڑکی دیکھتے ہو نا جو اس کارنر پر کھڑی ہے۔ جا کر اس سے بات کرلو۔''

''سر، ایسے کیسے بات کرلوں۔ نہ جان نہ پہچان۔ وہ تو جوتے مارے گی۔''

''ابھے، جوتوں سے ڈرنے لگے تو کبھی کچھ بھی نہ کر پاؤ گے۔''

''آپ کو یقین ہے کہ وہ راضی ہو جائے گی؟''

''سو فیصدی...''

ابھے نے آ گا دیکھا نہ پیچھا۔ سیدھا اس لڑکی کے پاس پہنچ گیا اور 'ہیلو' کہہ دیا۔

لڑکی نے مسکرا کر ابھے کا خیر مقدم کیا اور دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ابھے الجھن میں پڑ گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ آگے اس کے ساتھ کیسے پیش آنا ہے۔ وہ اسے کہاں لے جاتا۔ جگہ تو کہیں تھی نہیں۔ ہمت کر کے ابھے لڑکی کو لے کر میرے پاس آ گیا۔

''آپ کے پاس کہیں کوئی ٹھکانہ ہے۔'' میں نے لڑکی سے پوچھا۔

''نہیں میں آپ لوگوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' وہ بلا جھجھک بولی۔

''ہم تو پردیسی ہیں۔ یہاں ٹریننگ کے لیے کل ہی آئے ہیں۔ ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی بھی جگہ نہیں ہے۔''

جواب سن کر اس کا منہ اُتر گیا اور وہ گڈ بائی کر کے چلی گئی۔

''سر، کچھ اور دیکھا جائے۔'' ابھے نے پھر گزارش کی۔

''ہاں کیوں نہیں.....'' میں نے جواب دیا۔

ہم دونوں ایک ریستوران میں گھس گئے۔ ابھی کافی کا آرڈر دے ہی رہے تھے کہ سامنے دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت داخل ہوئی اور ادھر اُدھر دیکھتی رہی۔ میں نے سر کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ سیدھی ہمارے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ہیلو.....''

''ہیلو.....''

''میں ہوں والیا۔ اور یہ ہیں میرے دوست ابھے۔''

''میرا نام ہے سونالی۔''

اس کے بولنے کے انداز میں کچھ ایسی بناوٹ تھی کہ مجھے شک ہوا وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

''سونالی وہاٹ.....نام کے آگے پیچھے کچھ تو ہوگا۔'' میں نے سوال پوچھا۔

وہ اس غیر متوقع سوال سے بوکھلا گئی۔''سونالی میر چندانی۔''اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لیے اس نے غیر ارادی طور پر اپنی سہیلی کا سر نیم 'سونالی' کے ساتھ ملا دیا۔ میں نے اس مسئلے کو مزید طول دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اتنی دیر میں بیرا کافی لے کر آیا۔

''آپ کہاں رہتی ہیں؟''

''فریزر ٹاؤن۔''

''چلو اچھا ہوا آپ مل گئیں ورنہ اس اجنبی شہر میں ہمیں کون پوچھتا۔''

''آپ کہاں رہتے ہیں؟''

''فی الحال تو کہیں نہیں ۔ یہاں ٹریننگ پر آئے ہیں اور ہوسٹل میں رہتے ہیں۔''

''تو ہم ....؟''اس نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا مگر میں اس کے سوال کا مطلب سمجھ گیا۔

''یہی تو مصیبت ہے۔اگر آپ کے پاس کوئی جگہ ہو تو وہاں چلیں۔''

''سوری میرے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں ورکنگ ویمنز ہوسٹل میں رہتی ہوں۔''

''ہم مجبور ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر مجھے معاف کیجیے۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔''

وہ اٹھ کر چلی گئی۔ کپ میں آدھی کافی ابھی باقی تھی۔ میں خوش ہوا کہ چلو اس لڑکی سے بھی نجات ملی۔ابھے یہ سب کچھ غور سے دیکھ رہا تھا۔لڑکی پہچاننے اور اس کو رجھانے کے طور طریقے جتنے بھی میں نے اس کو ٹرین میں سکھائے تھے ان سبھی کی آزمائش ہو رہی تھی۔ وہ حیران تھا کہ ایک ایک حربہ کامیاب ہو رہا تھا۔ادھر کلاک ٹاور کی گھڑی نے سات بجا دیے۔ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''سر یہ ساری محنت تو بیکار چلی گئی۔ہم تو کچھ کر ہی نہیں پائے۔''

''بھئی ٹریننگ پیریڈ میں کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''سر، چک پیٹ چلیں، سنا ہے، بہت اچھی جگہ ہے۔''

''وہائی ناٹ، چلو۔'' میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تھری وھیلر سے ہم چک پیٹ پہنچ گئے۔ سارے ماحول کا جائزہ لیا اور پھر ایک بھڑوے کی ایما پر خلیل لاج کے اندر گھس گئے۔ منیجر صاحب نے ہمیں دیکھا تو خود ہی سمجھ گیا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے پوچھنے لگا۔''وانٹِڈ سر، لوکل، ساوتھ، نارتھ، نیپالی، آرچائنا۔''

''یس، پہلے ہم دیکھ لیں گے۔''

اس نے سامنے کھڑے آدمی کو کنڑ زبان میں کچھ ہدایات دیں۔ آنکھ جھپکتے ہی دس پندرہ سجی سنوری چھوکریاں ہمارے سامنے قطار میں کھڑی ہوگئیں۔ ابھے بچوں کی مانند ایسے اچھلا جیسے ڈھیر سارے کھلونے اس کے سامنے رکھ دیے گئے ہوں۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کس کھلونے سے کھیلے۔ آخر کار اس نے ایک لڑکی پسند کی اور اس کے ہمراہ کمرے میں چلا گیا۔ میں اس کا انتظار وہیں منیجر کے کمرے میں کرتا رہا۔ واپسی پر وہ تھری وھیلر میں ہی میرے شانے پر سر رکھ کر سو گیا۔

ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا۔ اگلے سنیچر کو ابھے پانڈے اپنی واپسی کی ٹکٹ بُک کرانے کے لیے ریلوے اسٹیشن چلا گیا۔ دیر رات جب لوٹ آیا تو جامے میں پھولا نہ سما رہا تھا۔ سیدھا میرے کمرے میں چلا آیا۔''سر، آج کمال ہوگیا۔''

''ایسا کیا ہوا۔''

''سر، کچھ نہ پوچھو۔ اِٹ واز وَنڈَرفُل۔''

''کچھ بتاؤ گے بھی یا نہیں۔''

''سر، یونو۔ اسٹیشن سے واپس آکر میں میجسٹک بس اسٹینڈ پر بس کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے پاس ہی ایک لڑکی، بغل میں دو چار کتابیں دبائے، آکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے وِش کیا۔ اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ پھر کیا تھا۔ راستے بھر باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے اس کا نام پوچھا۔''

ابھے نے ساری گفتگو حرف بہ حرف دہرائی۔

''مجھے اینی لِسی کہتے ہیں۔ ویسے لز کہنا زیادہ آسان ہے۔''

''میرا نام ابھے پانڈے ہے۔ یو کین کال می ابھے۔''

''آپ کیا کرتے ہیں؟''

''میں آرمی میں لیفٹیننٹ ہوں۔ یہاں کورس پر آیا ہوں۔ اور آپ...؟''

''میں مہارانی کالج میں پڑھتی ہوں۔ بی اے سیکنڈ ایئر۔''

''یہ کتابیں آپ کی اپنی ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''ونڈر فُل .....'دی پروفٹ' بائی خلیل جبران، 'جوناتھن لونگ سٹن سی گل' بائی رچرڈ بیک، 'فیوچر شاک' بائی آئن رینڈ، 'دی اسٹوری آف فلاسفی' بائی وِل ڈیورانٹ۔ دیٹ اِز گریٹ۔ لگتا ہے آپ فلاسفی کے اسٹوڈنٹ ہیں۔'' میں کتابوں کے نام پڑھتا رہا اور اس کے معصوم چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے بعد پھر بولا۔'' آپ ضرور فلسفے میں دلچسپی رکھتی ہوں گی۔ مجھے بھی اس مضمون میں کافی دلچسپی ہے۔''

''یس، دیٹ اِز رائٹ۔'' اینی بولی۔

ابھے نے بتایا کہ باتوں باتوں میں اس کا بس اسٹاپ چھوٹ گیا اور پھر دونوں ایچ اے ایل اسٹاپ پر اُتر گئے جہاں لِزا سے اپنے گھر لے گئی۔ اپنی لائبریری دکھائی اور اپنی ماں سے تعارف کرایا۔

پہلی ملاقات میں ہی وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے گھل مل گئے جیسے برسوں کی پہچان ہو۔

لِز نے ابھے کو اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ یہی کہ ''اس کا شرابی باپ اس کی ماں کی کمائی پر گُل چھرے اڑاتا ہے۔ روزانہ اس کو زدوکوب کرتا ہے مگر اس کی ماں سب کچھ سہہ لیتی ہے۔

وہ پاس ہی ایک ٹیلرنگ شاپ میں کام کرتی ہے۔رات کو بھی وہ پاس پڑوس سے سلائی کا کام لے آتی ہے تاکہ گھر چلتا رہے۔ پتاجی ہیں کہ نہ دن کا پتہ اور نہ رات کی خبر۔ جب گھر کی یاد آتی ہے تو رات کے اندھیرے میں لڑکھڑاتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ہم دو بہنیں ہیں اور ایک بھائی۔ میں سب سے بڑی ہوں۔تعلیم کے ساتھ ساتھ ٹیوشن بھی کرتی ہوں تاکہ ماں کو کچھ سہارا مل جائے۔ٹیوشن کے لیے ہی روزانہ میجسٹک جانا پڑتا ہے۔'' جاتے وقت لز نے چاروں کتابیں ابھے کو سونپ دیں۔'' آپ ان کو پڑھ لیجیے، میں بعد میں پڑھ لوں گی۔''

میں نے کتابوں کا غور سے معائنہ کیا اور لز کے شوق وذوق اور اس کی ذہانت کا قائل ہوگیا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ ابھے کے لیے یہ کتابیں کالا اکھشر بھینس برابر ہیں تاہم میں نے اسے کتابیں دینے کی درخواست کی۔''یار ابھے،تم ان کتابوں کو بعد میں پڑھ لینا۔ پہلے میں ان کا مطالعہ کرلوں۔''

''سر، آپ رکھ لو۔میرے کس کام کی۔ میں نے محض پٹانے کے لیے آپ کا فارمولہ نمبر تین استعمال کرلیا تھا۔''

''لڑکی کی دلچسپیوں کے بارے میں پتہ لگاؤ اور انہی موضوعات پر بحث چھیڑو۔ بحث کے دوران اس کے خیالات کی قدر کرو چاہے وہ کتنے ہی بھونڈے کیوں نہ ہوں۔اپنی دلچسپیاں یا اپنے خیالات اس پر ٹھونسنے کی کوشش مت کرو، فارمولہ نمبر تین۔''میں نے اپنے فقرے دہرائے اور پھر دونوں ہنس پڑے۔

''سر، کل پرسوں آپ سے بھی ملواؤں گا۔''اس نے غیر ارادی طور پر یہ فقرہ کہہ دیا مگر ابھی جملہ ختم ہی نہ ہوا تھا کہ وہ اپنی حماقت پر پشیمان ہوگیا۔ایسا لگا جیسے وہ ان سب الفاظ کو واپس نگل لینا چاہتا ہو۔اس کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ اگر اس نے لز کی ملاقات مجھ سے کروائی تو میں لز کو ضرور ورغلاؤں گا اور وہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔یہی وجہ تھی کہ اس نے بات کو زیادہ طول نہ دی یا سچ پوچھیے

تو بیچ میں ہی کاٹنے کی کوشش کی۔شاید وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ میں شیر کی مانند اپنا شکار خود مارنا پسند کرتا ہوں،شغال کی طرح مردار کھانا پسند نہیں کرتا۔لیکن اس کے شبہات نے اس کو اپنا اسیر بنالیا۔وہ اب مجھ سے کنارہ کرنے لگا اور میرے بدلے اپنے روم میٹ لیفٹننٹ مارکنڈے کو اپنے ہمراہ لیتا رہا۔

گو میں نے اس جانب کوئی خاص دھیان نہیں دیا مگر اوپر والے کے تماشے بھی نرالے ہوتے ہیں۔چند روز کے بعد لزا سے ملنے اسکول آ گئی۔ابھے اس وقت پیٹ کے درد کی وجہ سے کمانڈ ہاسپٹل چلا گیا تھا۔اس لیے مجھے لزکی خاطر داری کرنے کا موقعہ مل گیا۔چلتے چلتے اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔''آپ ابھے کے ساتھ کبھی ہمارے گھر آجایئے۔''

''ابھی تو ٹائم نہیں ہے۔جب ٹائم ملے گا،ضرور آ جاؤں گا۔''

''کبھی ٹائم نکالیے۔یو آر اے ونڈرفُل پرسَن۔اینڈ نالج ایبل ٹُو۔''

''تھینک یوٗ۔یہ تو آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔نہیں تو میں کس قابل ہوں۔ہاں ایک بات کہنا بھول گیا۔''

''کہیے......''

''آپ کی چوائس بہت اچھی ہے۔وہ کتابیں جو آپ نے ابھے کو دی تھیں میں آج کل ان کا مطالعہ کر رہا ہوں۔آپ کے اعلیٰ ذوق کی میں دل کی گہرائیوں سے قدر کرتا ہوں۔''

''آئی سی.......''

''آپ کو معلوم ہے۔آئن رینڈ از مائی فیورِٹ ٹُو۔''

''سچ...پھر تو دونوں کے خیالات ایک جیسے ہوں گے۔ہمیں کبھی اپنے خیالات کا تبادلہ کرنا چاہیے۔''

''ضرور....کیوں نہیں۔''

''آپ اگر اگلے اتوار کو خالی ہوں تو شام کے چار بجے میں سمفنی بلڈنگ کے مین گیٹ پر ملوں

گی۔ وہیں کسی ریستوران میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گا۔''

پھر کیا تھا۔ میں اتوار کو لز سے ملا اور وہ میری اچھی دوست بن گئی۔ میں نے دوست کا لفظ اس لیے استعمال کیا کیونکہ اس کے اور میرے بیچ مرد اور عورت کا عام رشتہ نہیں تھا۔ انٹلکچول سطح پر ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے جس میں شہوت اور بازاری پن کا کوئی شائبہ بھی نہ تھا۔ میں نے اس سے ابھے کے رشتے کے بارے میں کبھی کچھ بھی نہ پوچھا۔ وہ اس کا اپنا نجی معاملہ تھا۔ البتہ ہم دونوں نے اپنے دلوں کی کتابیں کھول کر ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیں۔ اپنے بارے میں جتنی بھی جانکاری دے سکتے تھے ایک دوسرے کو دیتے رہے۔ بیچ میں کہیں کوئی پردہ حائل نہ رہا۔

بچپن میں اس کو مشن اسکول سے اس لیے نکال دیا گیا تھا کیونکہ اس نے عیسیٰ مسیح اور مہاتما گاندھی کی برابری کی تھی جس پر اسکول کی راہبہ ناراض ہوگئی تھی۔ لز خوب پڑھنا چاہتی تھی اور پڑھ لکھ کر فلاسفر بننا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم جاری رکھی۔

اس نے اپنے دوستوں کے بارے میں کافی کچھ جانکاری دے دی۔ اس کا ایک ڈاڑھی والا تمل بوائے فرینڈ پرساد شہر ہی میں رہتا تھا اور اسے جی جان سے چاہتا تھا۔ وہ تمل لٹریچر میں ایم اے کر رہا تھا اور لیکچرار بننے کا خواہاں تھا۔ اپنی کا ایک گرو بھی تھا جو فلسفی تھا۔ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا اور اب بنگلور کے مینٹل اسائلم میں بند تھا۔ بڑا ہی مفکر قسم کا آدمی تھا۔ لز نے مجھے دونوں سے ملاقات کروائی۔

مجھے اس کی باتیں سن کر حیرت ہوئی۔ اس کی سادگی اور خلوص دیکھ کر اس پر ترس بھی آیا۔ مجھے کھٹکا لگنے لگا کہ کہیں کسی بے غیرت آدمی نے اس معصوم لڑکی کو اپنے دام فریب میں پھانس لیا تو وہ کہیں کی نہ رہ جائے گی۔ میں اپنے کیے پر بہت ہی نادم تھا۔ ابھے پانڈے کو لڑکیاں پھنسانے کے گُر نہ سکھائے ہوتے تو بے چاری لز اس کے جال میں نہ پھنستی۔ مجھے اس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگئی۔ مگر میں تنبیہ کرنے سے ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ برا نہ مان لے۔ اس کے ہمراہ میں نے بنگلور کا چپہ چپہ

چھان مارا۔لال باغ، ودھان سَودھا، گبن پارک، السور جھیل،اور بھی نہ جانے کیا کیا۔روزانہ شام کو جب وہ ٹیوشن پڑھانے جاتی میں اس کا انتظار بس اسٹینڈ پر کرتا اور واپسی پر ہم بہت سارا فاصلہ پیدل ہی طے کر لیتے تھے۔

''لِز.....اگر میرا کوئی چھوٹا بھائی ہوتا تو میں تمہاری شادی اس کے ساتھ کر لیتا۔''اس روز لال باغ میں ہم دونوں قدرت کی رنگینیوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔اس کا سر میری گود میں تھا۔میں نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

وہ چُپ چاپ سنتی رہی اور مسکرا دی۔میں پھر گویا ہوا۔''لِز! تم سے میری ایک ہی وِنتی ہے۔ زندگی میں تم ہرگز شادی نہیں کرنا۔وہ دن تمھاری موت کا دن ہوگا۔تم اپنی زندگی برباد کر لوگی۔مجھے نہیں لگتا کہ اس بھری دنیا میں تمھیں اپنے من کے موافق کوئی میت ملے گا جو تمھاری آکانکھشاؤں کی قدر کر سکے گا۔''

وہ چونک پڑی اور جواباً کہہ اٹھی۔''کیوں پرساد اچھا نہیں ہے۔اس نے تو کئی بار پروپوز کیا۔ میں ہی بات ٹالتی رہی۔اس وقت مجھے ماں اور بھائی بہنوں کا خیال آتا ہے۔''

''یہ میری مخلصانہ رائے تھی۔نہ جانے کیوں بنا مانگے دے دی۔یہ ضروری نہیں کہ تم اس پر عمل کرو اور پھر ہو سکتا ہے پرساد الگ قسم کا آدمی ہو۔''

لِز اور میرے بیچ کا یہ رشتہ انوکھا تھا۔ایک دوسرے سے ملنے کے لیے ہم تڑپتے رہتے۔رات کو جب بچھڑ جاتے تو دوسرے دن کی ملاقات کے لیے آنکھیں بچھائے رہتے۔وہ بارہا گارڈن میں اپنا سر میری گود میں رکھ کر سپنوں میں کھو جاتی۔میں اس کے بالوں کو سہلاتا رہتا مگر میرے دماغ میں کبھی پل بھر کے لیے بھی ایسے خیالات پیدا نہیں ہوئے جو دوسری لڑکیوں کے قرب سے پیدا ہوتے تھے۔ شہوت تو دور کی بات تھی کبھی بوسے یا پچکارنے کی خواہش بھی نہ ہوئی۔

پھر ایک روز بنگلور چھوڑنے کا وقت آ گیا۔اس سے الگ ہونے کے خیال ہی سے مجھے وحشت

سی ہونے لگی۔ رخصت ہونے سے تین چار دن پہلے میں نے ابھے سے پوچھا۔ ''یار، تم واپس کب جا رہے ہو؟''

''سر، چوبیس تاریخ کو۔''

''یعنی کورس ختم ہونے کے بعد تم تین دن یہاں ٹھہرو گے۔ لگتا ہے بنگلور سے ابھی جی نہیں بھرا۔ خیر میں تو اکیس تاریخ کو ہی چلا جاؤں گا۔''

''سر، پھر تو میں ریلوے اسٹیشن پر آپ کو سی آف کرنے کے لیے آ جاؤں گا۔''

''ہاں کیوں نہیں۔''

اور پھر اکیس تاریخ آ گئی۔ ابھے اور میں دونوں تھری وھیلر میں بیٹھ کر آدھا گھنٹہ پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گئے۔ ہم دونوں ٹرین کا انتظار کر رہے تھے کہ سامنے سے ایک خوبصورت جوڑا ہماری طرف چلا آیا۔ میں نے لز اور پرساد کو پہچان لیا۔ ابھے نے شاید پرساد کو پہلے نہیں دیکھا تھا البتہ لز کو دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر لز کو گلے سے لگایا اور پرساد کو بڑے ہی خلوص سے کہنے لگا۔ ''ہائے پرساد، ہَو آر یوٗ۔''

''اچھا ہوں۔ لز نے بتایا کہ آپ جا رہے ہیں اس لیے آپ کو الوداع کہنے چلا آیا۔

''سر۔ آپ لز کو جانتے ہیں؟'' ابھے سے رہا نہ گیا۔ اس کے چہرے کی نسیں تن گئیں۔

''ہاں لز کو میں تب سے جانتا ہوں جب وہ تمھیں ڈھونڈنے اسکول چلی آئی تھی۔ کیوں اس نے تمھیں نہیں بتایا۔''

''سر، ہم پھر ملے ہی کب جو وہ بتاتی۔'' لمحہ بہ لمحہ اس کی پریشانی اور تناؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ لز اس کیفیت سے بے خبر تھی جبکہ میں اس آگ میں مزید تیل ڈالتا جا رہا تھا۔

''اس نازک پھول کو آنکھوں میں بٹھا کر رکھنا۔ بہت ہی کومل ہے۔ ذرا سی بات سے کمھلا جائے گا۔'' میں پرساد سے مخاطب ہوا۔ پھر اپنی ڈائری پر لز اور پرساد دونوں کے پتے نوٹ کر لیے۔ میں

لز کو بار بار یاددہانی کراتا رہا کہ میں اس کے خط کا بیتابی سے انتظار کروں گا۔

ابھے پانڈے کا چہرہ تمتما رہا تھا مگر وہ اپنے جذبات پر قابو رکھنے میں کامیاب ہوا۔

گاڑی پلیٹ فارم پر لگ گئی اور میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کھڑکی کی آہنی سلاخوں کے بیچ میں سے میں تینوں کا ردِ عمل دیکھ رہا تھا۔ لز ابھے سے بے روک ٹوک باتیں کر رہی تھی اور پرساد بیچ بیچ میں ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا۔ لز کے من میں کہیں کوئی کدورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ البتہ ابھے پرساد کو خشمگیں نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندر ہی اندر ہنسی آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کتنا بیوقوف ہے ابھے۔ ایک ہی ملاقات میں اپنی کو اپنی ملکیت سمجھ بیٹھا۔

تینوں گاڑی چھوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں گاڑی نے الوداعی سیٹی بجائی۔ میں نے اشارے سے ابھے کو اپنے پاس بلایا اور خطیبانہ انداز میں کہنے لگا۔ ''کیوں دوست کیسا لگ رہا ہے؟''

''سر، میں کچھ سمجھا نہیں......!''

''دوست، میں نے تمھیں عشق بازی کے سارے اسباق سمجھا دیے تھے مگر ایک آخری سبق دینا بھول گیا۔ آج اسے بھی بتا رہا ہوں۔ ابھے، چاہے کوئی بھی میدان ہو، اپنے گُرو سے کوئی بات چھپانے کا نہیں اور یہ سبق سب سے اہم ہے۔ سمجھے....!''

میرا یہ اُپدیش اس کے زخمی دل میں نیزے کے پر کی طرح اٹک گیا۔ اس کی کلبلاہٹ کا مجھے پہلے سے ہی اندازہ تھا۔

گاڑی حرکت میں آ گئی۔ تینوں ہاتھ ہلا رہے تھے مگر لز کے ہاتھ ہلانے میں جو گرمجوشی اور ولولہ تھا وہ ابھے میں مفقود تھا۔

☆☆☆☆☆

مصنف کی تصانیف

افسانوی مجموعے:

۱۔ادھورے چہرے (اردواور ہندی)

۲۔چنار کے پنجے (اردواور ہندی)

۳۔زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی

۴۔ریزہ ریزہ حیات

۵۔روح کا کرب

تنقیدی مضامین و تبصروں کے مجموعے:

۶۔عصری تحریریں

۷۔عصری شعور

۸۔عصری تقاضے

مصنف پر لکھی گئی کتابیں

۱۔دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری (جاوید اقبال شاہ)

۲۔ورق ورق آئینہ۔دیپک بدکی: شخصیت اور فن (پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری)